دسمبر ۱۹۸۳

ملت اسلامیہ کا بیباک ترجمان

ماہنامہ

حیات نو

ANJUMAN TALBA-E-QADEEM

انجمن طلبۂ قدیم

جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڈھ یوپی (انڈیا)

BILARIAGANJ AZAMGARH U.P. INDIA

ابنائے فلاح متوجہ ہوں

برادران مکرم !

انجمن کے دو سالہ اجلاس منعقدہ ۲۱، ۲۲ر نومبر ۲۰۰۰ء کے موقع پر ایک مقالہ پیش کیا جائے گا جس کا عنوان ابنائے فلاح اور تحریک اسلامی ہوگا۔ اس موقع پر فلاحی بھائیوں کی تحریک اسلامی سے وابستگی، ان کی خدمات اور کارناموں کا ہلکا جائزہ اور مستقبل کے نیز منصوبے اور مشورے پیش کیے جائیں گے۔ آپ حضرات سے درخواست ہے کہ کسی قسم کی خاکساری اور عجز و انکسار سے کام لیے بغیر اپنی خدمات (جس شکل میں بھی کر رہے ہوں) اور مشغولیتوں سے درج ذیل پتہ پر اطلاع کریں تاکہ یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہونچ سکے۔

عبید اللہ فہد فلاحی
گلشن سہیل بدر باغ
علی گڑھ 202001

نوٹ:- خدمات چاہے تعلیم تدریس کی شکل میں ہوں یا اخبارات و جرائد سے وابستگی کی صورت میں، یا تصنیف و تحریر سے تعلق کی صورت میں، ضرور مطلع کریں۔

حیات نو

مدیر: نور محمد فلاحی

مدیر معاون: سید راشد علی حامدی

مجلس ادارت

شبیر احمد فلاحی — مرکز دہلی

نسیم احمد غازی فلاحی — مرکز دہلی

عبیداللہ فہد فلاحی — علی گڑھ

اشتیاق دانش فلاحی — علی گڑھ

عبیدالحق فلاحی — دعوت دہلی

شفیق عالم رانچوی — رانچی

اطہر ریحان فلاحی — ریاض

ذی الحجہ محرم سنہ ۱۴۰۳ھ ستمبر مطابق اکتوبر سنہ ۱۹۸۳ء

شمارہ نمبر ۷، جلد نمبر ۴

نقوش حیات نو

دھڑکنیں:

وطن کی فکر کر ناداں — سید راشد علی حامدی

بارگاہ نبوی سے:

صوم عاشورہ کی فضیلت — مولانا اقبال احمد قاسمی

مقالات:

ایمان اور کفر — عبیداللہ فہد فلاحی

تصوف — ابو طارق اصلاحی

خونِ تیرہ نگاہ جہانی — سید راشد علی حامدی

نبی اور رسول کا فرق قرآن و احادیث کی روشنی میں —
ترجمہ: نذیر احمد حجازی

علامہ ابن رشد — مولانا ابو بکر اصلاحی

نقش و نور:

پت جھڑ — رحمت علی صابر

پاگل — سید راشد علی حامدی

خرابِ مسجد سو گیا کون — (ادارہ)

شعر و نغمہ:

غزل —
شفق طاہری

عالم اسلام:

خانۂ شیخ کا نقش قدم یوں بھی ہے اور یوں بھی —
محمد سمیع اختر

کھرے کھوٹے:

جرأت بے مدعا — مولانا عبدالحکیم ایم۔ اے

اسلامی کردار — ضیاء الرحمن فلاحی

حلقۂ یاراں:

نرم گرم

جامعہ کے لیل و نہار

جمعیۃ الطلبہ کے ذمہ داران کا انتخاب، تقریب یوم آزادی

دھڑکنیں

وطن کی فکر کر ناداں!!

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریف سنگ

زندہ قوموں کی علامت یہ ہے کہ ان کے افراد ہمیشہ اپنے حالات کا جائزہ لیتے اور ان کا تجزیہ کرتے رہتے ہیں۔ ان میں حقیقت شناسی اور دوربینی کا وافر عنصر پایا جاتا ہے۔ ان کے فکر و عمل کی قوتیں ہمیشہ بیدار رہتی ہیں جس کے نتیجے میں ان کے اندر برابر ارتقاء کا عمل جاری رہتا ہے لیکن اس کے برعکس وہ قوم جو شتر مرغ کی طرح سر چھپا کر یہ محسوس کرتی ہے کہ اس نے مسائل سے نجات حاصل کرلی جو مسائل کو حل کرنے کے بجائے ان سے فرار کی راہیں ڈھونڈتی ہے اور ان کی نت نئی تاویلات و توجیہات میں لگ جاتی ہے تو وہ قوم جلد یا بدیر صفحہ ہستی سے اپنا نام و نشان کھو بیٹھتی ہے۔

قوت فکر و عمل پہلے فنا ہوتی ہے
تب کسی قوم کی عظمت پہ زوال آتا ہے

انسانوں کی طرح قومیں بھی بیمار اور صحت مند ہوا کرتی ہیں یعنی قوموں کی زندگی میں کچھ علامتیں ایسی ابھرتی ہیں جو ان کی ترقی وارتقاء اور صحت مند زندگی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں اور کچھ نشانیوں سے ان کے تنزل و انحطاط اور پستی کا پتہ چلتا ہے۔ کسی قوم کی زندگی کا آخری وقت وہ ہوتا ہے جب اس قوم کے ذمہ دار افراد اپنی قوم کو بامقصد اور تعمیری کاموں کی طرف لے جانے کے بجائے انھیں تخریب کاری اور بے مقصد کاموں پر آمادہ کریں اور ان کے اندر مثبت انداز فکر پیدا کرنے کے بجائے منفی انداز فکر پیدا کرکے انھیں انتشار و افتراق اور علیحدگی پسندی کا سبق سکھائیں۔

آج ہمارا ملک بھی کچھ اسی قسم کی بے مقصدیت کا شکار ہے۔ ایک طرف ملک کی سیاسی زندگی ایک خوفناک ویرانے یا کسی ہولناک جنگل کی تاریک رات کا منظر پیش کر رہی ہے۔ ملک کے اندر اتحاد و تعاون اور تحفظ و سالمیت کے جذبات پروان چڑھنے کے بجائے افتراق و انتشار اور علیحدگی پسندی کے رجحانات بڑی تیزی سے جنم لے رہے ہیں۔

امن وامان اور تحفظ و سلامتی کا نام و نشان مٹ چکا ہے ہندوستان کا کوئی صوبہ ایسا نہیں جہاں لوگ اپنے آپ کو غنڈہ عناصر کی چیرہ دستیوں سے محفوظ و مامون پاتے ہوں تو دوسری طرف ملک کی سماجی اور معاشرتی زندگی سے تعلق کے بکھیڑے الگ رہے ہیں، خدا بیزار، مادیت زدہ اور اباحیت پسند ماحول سے اس کے سوا توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے۔ ابھی حال ہی میں بمبئی شہر میں پولس کی ہڑتال، تخریب کاری اور فوج سے تصادم کے جو افسوس ناک واقعات منظر عام پر آئے وہ ہر حساس اور عقل و شعور رکھنے والے کو بے چین کر دینے کے لئے کافی ہیں یہ واقعات ارباب عقل و دانش کو دعوت غور و فکر دے رہے ہیں کہ اس قوم کا کیا حشر ہوگا جس کے ذمہ دار افراد تشدد پسندانہ ذہنیت کے حامل ہوں اور وہ افراد جن کو قانون کی حفاظت کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو جب اپنے مطالبات کو تسلیم کرانے کے لئے خود ہی قانون توڑنے اور خون خرابہ کرنے پر تل جائیں تو پھر ملک کا کیا بنے گا؟ ان افراد کی اخلاقی حالت کا اندازہ کیجیے جو عوام کو قانون سے روکنے کے ذمہ دار ہوں مگر خود اپنے مفادات کی خاطر تخریب کاری اور تشدد پسندی کا مظاہرہ کر کے اپنی قانون شکنی اور قانون بیزاری کا ثبوت مہیا کریں۔

اگر یہ کہا جائے تو ہرگز بے جا نہ ہوگا ________ کہ پورا ملک علیحدگی پسندی اور باہمی کشمکش کے کوہ آتش فشاں پر کھڑا ہے۔ قومی، گروہی اور لسانی عصبیات ملک کی سالمیت کے لئے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات، اقلیتوں کے جانی و مالی نقصانات کے ساتھ ملک کی معیشت پر بھی اثر انداز ہو رہے ہیں۔

تعجب تو اس بات پر ہے کہ ہمارے سیاست داں اس حقیقت سے باخبر ہوتے ہوئے بھی تجاہل برت رہے ہیں اور اپنی کرسیوں کے تحفظ و استحکام میں کوشش صرف کر رہے ہیں اگر اس وقت ہم نے ان رجحانات کو ختم کرنے کی سعی و جہد نہ کی تو خدا نہ کرے ـــ

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنے والی   تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو   تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

سید راشد علی حامدی

بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے

اقبال احمد قاسمی
استاذ جامعۃ الفلاح

یوم عاشورہ کے فضائل

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدم المدینۃ فوجد الیہود صیاما یوم عاشوراء فقال لہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما ھذا الیوم الذی تصومونہ۔ فقالوا ھذا یوم عظیم۔ انجی اللہ فیہ موسیٰ و قومہ وغرق فرعون وقومہ۔ فصامہ موسیٰ شکراً فنحن نصومہ۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فنحن احق واولیٰ بموسیٰ منکم۔ فصامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وامر بصیامہ۔ متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے یہودیوں کو عاشوراء کے دن روزہ رکھتے ہوئے پایا تو ان سے فرمایا کہ یہ کون سا دن ہے جس کا روزہ تم رکھتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک عظیم دن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روز موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو نجات بخشی اور فرعون اور اس کی قوم کو غرق کر دیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے شکریہ کے طور پر اس دن روزہ رکھا اس لئے ہم بھی رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے مقابلے میں ہم لوگ موسیٰ علیہ السلام کے زیادہ حقدار اور ان سے قریب تر ہیں چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کا روزہ رکھا اور دوسروں کو بھی رکھنے کا حکم دیا۔

یوم عاشوراء محرم الحرام کی دسویں تاریخ کو کہتے ہیں۔ محرم کا مہینہ بڑی فضیلت و اہمیت کا حامل ہے۔ خاص طور سے اس مہینے میں روزہ رکھنا بہت زیادہ باعث اجر و ثواب ہے۔ چنانچہ نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ہے۔

(۱) افضل الصیام بعد رمضان شہر اللہ المحرم۔ و افضل الصلوٰۃ بعد الفریضۃ صلاۃ اللیل۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ اللہ کے مہینہ محرم کا ہے۔ اور فرض نماز کے بعد سب سے افضل نماز، رات کی نماز ہے۔

(۲) عن علی رضی اللہ قال سألہ رجل فقال ای شہر تامرنی ان اصوم بعد شہر رمضان فقال لہ ما سمعت احدا یسئل عن ھذا الا رجلا سمعتہ یسئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ای شہر تامرنی ان اصوم بعد رمضان۔ قال ان کنت صائما بعد رمضان فصم المحرم فانہ شہر اللہ، فیہ یوم تاب اللہ فیہ علی قوم ویتوب علی قوم آخرین

— ترمذی

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ان سے پوچھا کہ رمضان کے بعد آپ مجھے کس مہینے کا روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہیں۔ انہوں نے اس سے فرمایا میں نے ایک شخص کے سوا کسی اور کو اس کے متعلق سوال کرتے ہوئے نہیں سنا میں نے سنا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ رہا تھا اس وقت میں حضورؐ کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا، کہ اے اللہ کے رسول! رمضان کے بعد آپ مجھے کس مہینے کا روزہ رکھنے کا حکم دیتے ہیں، آپ نے فرمایا۔ اگر تم کو رمضان کے بعد روزہ رکھنا ہے تو محرم کے روزے رکھو۔ کیونکہ وہ اللہ کا مہینہ ہے اس میں ایک ایسا دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کی توبہ قبول کی اور آئندہ کچھ لوگوں کی توبہ قبول فرمائے گا۔

یوم عاشوراء اسلامی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت و فضیلت کا حامل ہے۔ اس روز اسلامی تاریخ کے بہت سے اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی تاریخ کو حضرت آدمؑ منصب خلافت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے دنیا میں بھیجے گئے اور اسی روز ان کی توبہ بارگاہ ایزدی تک شرف قبولیت سے ہمکنار ہوئی۔ حضرت نوحؑ کی کشتی

اسی دن کوہ جودی پر ٹھہری اور ان کو ان کے اہلِ ایمان ساتھیوں کو طوفان سے نجات بخشی گئی۔ حضرت موسیٰؑ اور ان کی قوم بنی اسرائیل کو فرعون اور اس کے ظلم و ستم سے چھٹکارا دلایا گیا اور فرعون اور اس کی قوم کو غرقاب کیا گیا۔ ان واقعات کی وجہ سے یہ دن اسلامی تاریخ میں ایک یادگار اور ناقابلِ فراموش دن بن گیا۔ اور اس کا روزہ بہت زیادہ اجر و ثواب کا باعث قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ مندرجہ ذیل احادیث اس پر روشنی ڈالتی ہیں۔

(۱) عن ابی قتادۃ رضی اللہ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل عن صیام عاشوراء فقال یکفر السنۃ الماضیۃ — مسلم

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ وسلم سے عاشوراء کے روزے کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ روزہ سال گذشتہ کے گناہوں کا کفارہ بنتا ہے۔

مسلم شریف میں اسی حضرت ابو قتادہ سے ایک دوسری روایت بھی مروی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:—

احتسب علی اللہ ان یکفر السنۃ التی قبلھا

میں گمان کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس سے پہلے سال کے گناہ معاف فرما دے گا۔

(۲) عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال ما رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتحری صیام یوم فضلہ علی غیرہ الا ھذا الیوم یوم عاشوراء وھذا الشھر یعنی شھر رمضان۔ — متفق علیہ

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عاشوراء اور ماہ رمضان کے روزوں کی طرح کسی اور دن کے روزے کے لئے تحری رکھتے ہوئے اور تحقیق کرتے نہیں دیکھا

رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے یوم عاشوراء کا روزہ فرض تھا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے —

کان عاشوراء یوم تصومہ القریش فی الجاھلیۃ وکان رسول اللہ یصومہ وامر الناس بصیامہ۔ فلما قدم المدینۃ صامہ وامر الناس بصیامہ۔ فلما افترض رمضان کان رمضان ھو الفریضۃ وترک عاشوراء فمن شاء صامہ ومن شاء ترکہ (ترمذی)

زمانۂ جاہلیت میں اہلِ قریش یوم عاشوراء کو روزہ رکھتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اس دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے لوگوں کو بھی روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے پھر جب آپ مدینہ تشریف لائے تب بھی آپ نے اس کا روزہ رکھا اور لوگوں کو رکھنے کا حکم دیا۔ مگر جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو رمضان کے روزے ہی فرض رہ گئے اور عاشوراء کے روزے کی فرضیت ختم کر دی گئی۔ اب اس کے بعد جس کا جی چاہتا اس روزے کو رکھتا اور جس کا جی چاہتا وہ چھوڑ دیتا۔

اس روایت سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ عاشوراء کے روزے کے متعلق آپ کا یہ حکم امرِ لازم تھا کوئی امرِ اختیاری نہ تھا۔ اس بات کی تائید مندرجہ ذیل احادیث سے بھی ہوتی ہے —

(۱) عن ابن عباس رضی اللہ عنھما ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صام عاشوراء وامر بصیامہ — متفق علیہ

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کا روزہ خود بھی رکھا اور دوسروں کو بھی رکھنے کا حکم دیا

(۲) عن جابر ابن سمرۃ قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یامر بصیام یوم عاشوراء ویحثنا علیہ ویتعاھدنا

حضرت جابر ابن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاشوراء کی تاریخ آنے پر ہم کو اس دن روزہ رکھنے کا ہمارا اس کا حکم دیتے

عندہ فلما فرض رمضان لم یامرنا ولم ینھنا ولم یتعاھدنا عندہ۔ (مسلم)

اور اس کی تاکید فرماتے تھے

رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد عاشوراء کے روزے کی فرضیت ساقط ہو گئی۔ اب اس کا رکھنا لازم نہیں رہا بلکہ اختیاری ہو گیا چنانچہ صحابہؓ میں سے بہت سے لوگ اس دن روزہ رکھتے تھے اور بہت سے نہیں رکھتے تھے مگر جہاں تک نبی کریمؐ کی ذات کا تعلق ہے تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے پابندی کے ساتھ عاشوراء کے دن روزہ رکھا ہے۔ ام المومنین حضرت حفصہؓ بنت عمرؓ فرماتی ہیں۔

اربع لم یکن یدعھن النبی صلی اللہ علیہ وسلم صیام عاشوراء والعشر وثلاثۃ من کل شھر ورکعتان قبل الفجر (نسائی)

حضورؐ چار کام کبھی نہیں چھوڑتے تھے یوم عاشوراء، محرم کے دس دن اور ہر ماہ تین دن کے روزے اور نماز فجر سے پہلے کی دو رکعتیں

عن ابن عباس رضی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صام عاشوراء وامر بصیامہ (متفق علیہ)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم عاشوراء کے دن روزہ رکھا اور اسے رکھنے کا حکم دیا۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنھما قال ما رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتحری صیام یوم فضلہ علی غیرہ الا یوم عاشوراء

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہتے ہیں کہ میں نے یوم عاشوراء اور رمضان کے روزوں کی طرح کسی اور روزے کے لئے تحری کرتے نبی کریمؐ کو نہیں دیکھا

اگرچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ صرف دسویں محرم کو روزہ رکھا۔ نویں تاریخ کو روزہ رکھنا آپ سے ثابت نہیں ہے مگر عام فقہا کے نزدیک نویں اور دسویں دونوں تاریخوں کے روزے مسنون ہیں۔ نور الایضاح میں ہے

واما المسنون فھو صوم یوم عاشوراء مع التاسع

رہا مسنون روزہ تو وہ یوم عاشوراء کا روزہ ہے نویں سمیت۔

عملاً آپ نے ۹ محرم کو روزہ نہیں رکھا مگر گزشتہ میں آپ نے اس ارادہ کا اظہار فرمایا تھا کہ اگر آئندہ سال زندگی رہی تو نویں محرم کو بھی روزہ رکھوں گا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لئن بقیت الی قابل لاصومن التاسع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آئندہ سال زندہ رہوں گا تو نویں محرم کو روزہ رکھوں گا۔

پیارے نبیؐ کی زندگی نے اگلے محرم تک وفا نہ کی اس لئے آپ کا یہ ارادہ عملی جامہ نہ پہن سکا مگر چونکہ آپ نے اس کا ارادہ فرمایا تھا اور انتقال کی وجہ سے اس پر عمل نہ فرما سکے اس لئے اب سنت یہی ٹھہری ہے کہ نویں اور دسویں دونوں تاریخوں کو روزہ رکھا جائے۔ نویں کو چھوڑ کر صرف دسویں کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتح القدیر میں ہے۔

المسنون عاشوراء مع التاسع والمکروہ تنزیھا عاشوراء مفردا عن التاسع

مسنون عاشوراء کا روزہ ہے نویں کے ساتھ۔ نویں کو چھوڑ کر صرف دسویں کا روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

اس فیصلے کے پس منظر پر وہ حدیث روشنی ڈالتی ہے جس کو صاحب مشکوٰۃ نے مسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے

عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال حین صام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عاشوراء وامر بصیامہ قالوا یا رسول اللہ انہ یوم یعظمہ الیھود والنصاری فقال رسول اللہ صلی اللہ

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کا روزہ رکھا اور دوسروں کو اسکے رکھنے کا حکم دیا تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول یہ تو وہ دن ہے جس کی تعظیم یہود ونصاریٰ

علیہ وسلم لئن بقیت الی قابل لاصومن التاسع
کرتے ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ اگر میں آئندہ سال زندہ رہا تو نویں محرم کو روزہ رکھوں گا۔

دراصل حضور کو توقع تھی کہ یہودی اسلام کی طرف مائل ہوں گے اور ایمان قبول کریں گے۔ اسی لئے ابتداء میں قرب و دوستی پیدا کرنے اور ان کی تسلی و دلدہی کے طور پر متعدد باتوں میں ان کی موافقت اختیار کی اور ان کی موافقت میں عاشوراء کا روزہ بھی رکھتے رہے مگر جب اتمام حجت اور پوری کوشش کے باوجود ان کے رویے میں کسی قسم کی تبدیلی رونما ہوئی اور اس کی امید بھی ختم ہو گئی تو آپ نے ان کی مخالفت کا فیصلہ فرمایا اور اعلان کر دیا کہ آئندہ یہودیوں کی مخالفت میں نویں کا روزہ بھی رکھا جائے گا۔ اس سلسلے میں امام ترمذی نے حضرت ابن عباس رضی کا یہ قول نقل کیا ہے۔

صوموا التاسع والعاشر وخالفوا الیہود
نویں اور دسویں محرم کو روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو۔

حضرت ابن عباس رض کے اس قول کی بنیاد وہ حدیث ہے جس کو امام احمد ابن حنبل نے حضرت ابن عباس رض ہی سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

صوموا عاشوراء وخالفوا فیہ الیہود وصوموا قبلہ یوما او بعدہ یوماً۔
آپ نے فرمایا کہ عاشوراء کے دن روزہ رکھو اور اس میں یہودیوں کی مخالفت کرو۔ اور اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد روزہ رکھو۔

اس کا ذکر ترمذی شریف کے حاشیہ پر بھی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:—

الافضل ان یصوم یوم العاشر ویوما قبلہ ویوما بعدہ وقد جاء ذالک فی حدیث
افضل یہ ہے کہ دسویں محرم کو اور اس سے ایک دن پہلے اور ایک دن بعد روزہ رکھا جائے۔

(تحفہ حاشیہ ترمذی)

بعض اہل علم کے نزدیک عاشوراء سے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھنا مستحب ہے۔ مشکوٰۃ کے حاشیہ پر مشہور فقیہ امام ابن ہمام کا یہ قول درج ہے۔

یستحب ان یصوم قبل العاشوراء یوما او بعدہ یوما فان افردہ فھو مکروہ۔
مستحب یہ ہے کہ دسویں تاریخ سے ایک دن قبل یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھا جائے۔ تنہا دسویں تاریخ کو روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

اور بعض اہل علم عاشوراء کے روزے کے ساتھ نویں اور گیارہویں محرم کو بھی روزہ رکھنا افضل قرار دیتے ہیں۔ الافضل ان یصوم یوم العاشر ویوما قبلہ ویوما بعدہ۔
(حاشیہ ترمذی)

دسویں اور اس سے ایک دن قبل اور ایک دن بعد روزہ رکھنا افضل ہے۔

(بقیہ صفحہ ۳۹) اور اس کے لئے جدوجہد کریں یہ بہت بڑی بات ہے کہ ہمیں اس بات کا احساس ہو گیا ہے کہ ہمارا راستہ غلط ہے اگر ہم جدوجہد کریں تو جس طرح ہم نے انگریزوں سے نجات حاصل کی اسی طرح ہم اس غلط نظام حکومت سے بھی چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں اور حکومت الٰہیہ قائم و نافذ کر سکتے ہیں ہمارے پاس آج بھی وہ نسخہ موجود ہے جو انسان کے تمام مسائل کا حل ہے بس ہمارے اندر یہ جذبہ ہونا چاہئے کہ ہم اس پیغام کو عام کریں گے۔

اعتذار

گزشتہ شمارہ میں ہماری خواہش کے علی الرغم کتابت اور طباعت کی بیشمار خامیاں رہ گئیں جس کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

(ادارہ)

عبداللہ فہد فلاحی

آخری قسط

ایمان اور کوڑے

اسی ایمان خدا پرستانہ تربیت کا نتیجہ تھا کہ اخوانیوں نے اپنے وطن اور اپنے خدا کی راہ میں جیتی بہا قربانیاں دیں لیکن کسی پر احسان نہیں جتایا بلکہ اللہ نے انھیں ہدایت سے نواز کر ان پر احسان کیا تھا۔ شاہی دور اور پھر عہد ناصری میں (۱۹۴۸ء، ۱۹۵۴ء، ۱۹۶۵ء) انھیں کوڑوں سے پیٹا گیا ان پر بدترین عذاب اور سزائیں روا رکھی گئیں لیکن راہ خدا میں ان زخموں پر کمزور نہ ہوئے۔ بزدلی نہیں دکھائی اور نہ پست ہمتی کا مظاہرہ کیا۔ حتی کہ ان میں سے بہتوں کو کتوں سے نچوایا گیا اور کتنوں کو سرخ سلاخوں سے داغا گیا۔ بہت سے مجاہدین ایسے بھی تھے جن کے بدن کرینوں سے پھاڑ دیئے گئے۔ بہت سے اخوانی عہد انقلاب میں مسلسل بیس سال تک قید خانوں میں ایڑیاں رگڑتے رہے۔ علی الاعلان کتنے ہی بھائیوں کو لیمان طرہ جیسی قتل گاہوں میں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ اور بہتیرے نوجوان کوڑوں کی مار کھا کر تنگ ٹھور سے ملک عدم پہونچ گئے۔ اور ان نوجوانوں کی تعداد کی دہائیوں تک جا پہونچتی ہے ضروری ہے کہ ان پر سے پردہ اٹھایا جائے اور تاریخ ان سے واقفیت حاصل کرے۔ ایسے جیالوں کی تعداد بھی کم نہیں جنھیں ناحق پھانسی کے تختوں پر چڑھا دیا گیا لیکن کسی اخوانی نے اسلام کو پسند کرنے اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کرنے کے بعد کفر کا ارتکاب نہیں کیا جس طرح عصمت کے بعد زنا کی طرف توجہ نہ کی اور نہ بغیر حق کے کسی کو قتل کیا ہر ایک کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ یہ کہتا تھا کہ میرا رب اللہ ہے اور میرا دستور قرآن ہے!!

باعث تعجب یہ نہیں ہے کہ انسان خطا کرے بلکہ اس کا گناہ پر اصرار اور توبہ نہ کرنے کی روش ہی اصل گناہ اور کبر ہے۔ آدمؑ سے بھی غلطی ہوئی لیکن انھوں نے اللہ سے توبہ کی تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی اور انھیں معاف کر دیا۔

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ

(طٰہٰ ۱۲۱، ۱۲۲)

(ترجمہ:- اور آدمؑ نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہ راست سے بھٹک گیا پھر اس کے رب نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول کر لی اور اسے ہدایت بخشی)

لیکن ابلیس نے گناہ کیا تو اس کی مغفرت نہیں ہوئی کیونکہ اس نے توبہ نہ کی تھی۔ اور اپنے رب کے سامنے معذرت پیش نہ کی تھی بلکہ اکڑ گیا اور جھکنے سے انکار کر بیٹھا اس نے کہا۔

أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ

(ترجمہ:- میں اس سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اسے مٹی سے)

جبکہ آدم اور ان کی بیوی نے اپنے رب سے یوں دعا کی۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ

(اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم کیا اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے)

آدمؑ اور ان کی بیوی کی غلطی ایک عارضی غفلت کا نتیجہ تھی جس کے بعد جلد ہی اور خالص توبہ نے اسے مٹا دیا اللہ تعالیٰ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان پر دوبارہ مہربان ہو گیا لیکن ابلیس کا گناہ

خدا کی نافرمانی و سرکشی، اس کے احکام سے انحراف اور اس کی اطاعت سے انکار کی پیداوار تھا، اسی لئے اللہ نے اسے ہمیشہ کیلئے دھتکار دیا اور قیامت تک کے لئے اسے ملعون قرار دیا۔

اخوان بھی حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں اس لئے ان میں کچھ خطاکاروں کا پایا جانا باعث تعجب نہیں جو اوامر کی خلاف ورزی کر بیٹھیں اور منہیات کا ارتکاب کر لیں لیکن بہترین گناہ گار وہ ہوتا ہے جو جلد خدا کی طرف پلٹے اور اس سے مغفرت چاہے اور یہی وہ تدبیر ہے جس سے قلوب شفایاب ہو سکتے ہیں۔

خالص توبہ اور سچا استغفار اس وقت ہو سکتا ہے جب گناہ گار آدمی کو احساس ہو جائے اور رب کی سزاؤں کا اسے خوف ہو اور پھر سے جذبۂ عبودیت اور اعتراف کے انکسار کے ساتھ خدا کے سامنے جھکنے کی اسے عادت ہو۔

ان تمام چیزوں کو اختیار کرنے کے ساتھ اخوانیوں نے ہر مصیبت و تکلیف اور راہ حق کی ہر قربانی کو صرف خدا کیلئے خالص رکھا۔ انھوں نے اپنی جانیں اور اپنے اموال اللہ کے ہاتھ بیچ دیئے اور اللہ سے ان چیزوں کے بدلے جنت خرید لی۔ انھوں نے اس تجارت کو فسخ نہیں کیا نہ اس سے منہ موڑا اور انشاءاللہ وہ ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے جنت کے بدلے میں انھیں کوئی چیز گوارا نہیں ہے۔

ظلم کا بدلہ نہیں لیا

یہی وجہ ہے کہ اخوانیوں نے ان ظالموں سے انتقام لینے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا جنھوں نے انھیں قید کیا تھا، تعذیب کے مختلف مراحل سے گزارا تھا، ان کے اموال ضبط کر لئے تھے، ان کے خاندانوں کو بھوک و پیاس سے تڑپایا تھا اور ان میں سے بہتوں کو علانیہ یا خفیہ قتل کیا تھا۔ کسی نے یہ نہیں سنا کہ ان مظلوموں نے کسی جلاد پر حملہ کیا ہو اس کی دائیں یا بائیں آنکھ میں گولی چلائی ہو حالانکہ وہ ایسا کرنے کی قدرت رکھتے تھے کیونکہ ان میں ایسے تربیت یافتہ فوجی بھی تھے جنھوں نے یہودیوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا اور انگریزوں پر رات کی نیندیں حرام کر دی تھیں لیکن ان کی تربیت انھیں ایسا سوچنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ انھوں نے اپنے دشمنوں کا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تو اس نے ان سے یکے بعد دیگرے انتقام لیا آخرت سے پہلے اسی دنیا میں انھیں مزہ چکھایا اور آخرت کی سزا شدید تر اور سب سے زیادہ رسوا کن ہے ہی۔ اخوان کی تربیت اور ان کے ارادے اور ان کا نصب العین ان چھوٹے یا بڑے ظالموں سے انتقام لینے کی منزل سے بہت آگے تھا۔

اللہ نے اخوانیوں کو اسی دنیا میں ان جلادوں کا انجام بد دکھا دیا کہ وہ کس طرح ذلیل و رسوا ہوئے یا دیوانگی اور کوڑھ جیسی بیماریوں کا شکار ہو گئے یا بری طرح قتل کر دیئے گئے۔ حتیٰ کہ شیخ حسن الہضیبی نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اپنے گرفتار کرنے والوں کو دیکھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ اور اخوانیوں کے ساتھ جیل کے دروازے سے داخل ہو رہے ہیں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہے ہیں جبکہ اخوان نے قید و بند کو سورماؤں کی مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کیا تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سارے ہی اخوانی خدا پرستی کے اس اعلیٰ مقام پر تھے لیکن میں پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ خدا پرستی کی یہ روح اور تابناک پہلو ان پر غالب ہے۔ ان میں سے اکثر کی یہی حالت ہے۔ اطاعت رسول ان میں عام ہے اور معصیت شاذ ہے وہ بڑی بڑی امیدیں وابستہ کرتے ہیں لیکن چھوٹی شہوتوں کے قریب بھی نہیں جاتے دنیا کی آلائشوں سے دامن بچا کر آخرت کی نعمتوں پر ان کی نظر ہے۔ خاص منافع سمیٹنے کے بجائے عمومی مسائل سے انھیں دلچسپی ہے۔ اور اگر کسی کو شیطان نے ورغلایا اور اس کے قدم پھسل گئے تو جلد ہی اس کا ضمیر جاگ اٹھتا ہے اس کا دل رجوع کرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کا دروازہ ندامت و پشیمانی کے ساتھ روتے ہوئے کھٹکھٹاتا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک نوجوان کا دل مچل گیا۔ اس کی طبیعت نے اسے ستانا شروع کیا اور اسکے ضمیر پر حاوی

کمزوری اور غفلت کی چادر تن گئی تھی کی وجہ سے وہ معصیت کا ارتکاب کر بیٹھا پھر اچانک اسے ہوش آیا کہ اس نے پاکیزگی کے بعد گندگی کیوں اختیار کر لی؟ سیدھی سچی راہ کو چھوڑ کر انحراف کیوں کیا؟ ہدایت کے بعد گمراہی میں کیسے پڑ گیا؟ اطاعت کی حلاوت چکھنے کے بعد معصیت کی تلخی کیسے گوارا کر لی؟ اس احساس کے بیدار ہوتے ہی وہ اپنے گھر کی چہار دیواری میں مقید ہو گیا۔ اپنے نفس پر روتا رہا۔ احساس کے شعلوں پر لوٹتا پلٹتا رہا۔ زمین اپنی کشادگی کے باوجود اس پر تنگ ہو گئی اور اس کا نفس اس پر تنگ ہو گیا۔ چنانچہ اسے کسی سے ملنے اور گھر سے باہر نکلنے کا یارا نہ رہا۔ اسے اپنے رب سے حیا تھی اپنے نفس سے ندامت تھی اور اپنے اخوان و دوستوں سے منہ چھپانا چاہتا تھا جبکہ میرے سوا ان میں سے کسی کو اس حادثہ کی خبر نہ تھی۔ میں نے اس کے پاس لکھا کہ اس کیلئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور اللہ کی مغفرت کی توقع ہے۔ اسے میں نے رسول کریم ﷺ کی یہ حدیث یاد دلائی کہ جس کو اس کی نیکی خوش کرے اور اس کی برائی اسے رنجیدہ کر دے وہ مومن ہے اور یہ قول بھی کہ "وہ برائی جو تجھے غمگین کر دے اس نیکی سے (اچھی) ہے جو تجھ کو کبر و غرور میں مبتلا کر دے" اور ابن عطاء اللہ کا یہ قول بھی یاد دلایا کہ "وہاں بسا اوقات تمہارے لئے اطاعت کا دروازہ کھلا رہتا ہے لیکن قبولیت کا بند رہتا ہے اور کبھی کبھی معصیت تم پر غالب آجاتی ہے تو وہ وہاں پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ وہ گناہ جو انکسار و خاکساری لائے اس اطاعت سے بہتر ہے جو تکبر اور گھمنڈ پیدا کر دے"

***

بقیہ صفحہ ۱۲

انسان ہے جبکہ ان کے اندر قبول اصلاح کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور وہ دوسروں کے بالمقابل اس سے قریب تر ہیں۔ اگر ان کی صحیح طور پر قیادت کی جائے۔ اور اس کے لئے ضرورت صرف یہ ہے کہ چند صالح اور مخلص علماء ان گروہوں کا جائزہ لیں اور ان کے حالات کا صحیح مطالعہ اور اندازہ کریں اور اس علمی ذخیرہ کو آمیزش سے پاک و صاف کر کے اس کو مفید بنائیں اور ان لوگوں کی صحیح قیادت کریں۔

مجھے یاد ہے کہ سید توفیق بکری نے اس سلسلہ میں بہت کچھ سوچا اور شیوخ طریقت کا علمی اور عملی مطالعہ اور جائزہ بھی لیا اور اس سلسلہ میں ان کے لئے ایک کتاب بھی تالیف کی۔ لیکن یہ تجویز چل نہ سکی اور ان کی وفات کے بعد شیوخ طریقت نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور مجھے یاد آتا ہے کہ سید عبداللہ عفیفی نے بھی اس کی طرف توجہ کی اور وہ ازہر کے شیوخ اور دیگر علماء دین سے اکثر اس سلسلہ میں گفتگو کرتے رہتے۔ لیکن یہ کوشش صرف علمی اور نظری بحثوں تک محدود رہ گئی۔ عملاً اس سلسلہ میں انھوں نے کچھ نہیں کیا۔

اگر ازہر کی علمی قوت، مصلحین وقت کی عملی طاقت اور شیوخ کی روحانی صلاحیت یہ سب مل گئی ہوتیں تو اس امتزاج سے ایک ایسی بے نظیر امت ظہور پذیر ہوتی جو خود رہنمائی اور قیادت کرتی وہ محتاج قیادت نہ ہوتی۔ وہ دوسروں پر اثر انداز ہوتی نہ کہ خود دوسروں سے اثر قبول کرتی۔ اور وہ اس بھٹکی ہوئی انسانیت کو صحیح راہ پر لگاتی۔

ابو شارق اصلاحی

تصوف ــــــ شہید حسن البناؒ کی نظر میں

(مرحوم شیخ حسن البنا کی خود نوشت ڈائری (المذکرات) کا ایک باب)

دعوت اسلامی کی تاریخ میں تصوف اور سلوک کا کیا مقام ہے؟ اس سلسلہ میں اپنے خیالات کو اس ڈائری میں قلمبند کر دینا خالی از فائدہ نہ ہوگا۔ تصوف کی ابتدا کب سے ہوئی اس کے اثرات کیا مترتب ہوئے؟ اور بعد میں اس نے کیا صورت اختیار کی؟ اور پھر یہ کیونکر اسلامی معاشرہ کے لئے مفید ہو سکتا ہے؟ ذیل کی سطور میں ان سے متعلق گفتگو ہوگی واضح رہے کہ یہاں اس بحث کا نہ تو علمی احاطہ مقصود ہے۔ اور نہ اسکی اصطلاحات سے تعرض کیونکہ ڈائری میں اپنے خیالات اور احساسات کو قلمبند کر دینا مقصود ہوتا ہے تاکہ محو ہونے سے محفوظ ہو جائیں۔ پس اگر میرے یہ خیالات صحیح ہوں تو یہ اللہ کی توفیق ہے اور وہی شکر کا مستحق ہے اور اگر اس کے برعکس ہوں تو میری نیت نیک اور صاف ہے۔

قرن اول میں جب اسلامی مملکت کی آبادی بہت بڑھ گئی اور اسکی فتوحات کا دامن بہت پھیل گیا اور ہر طرف سے دنیا مسلمانوں پر جھک پڑی اور انکے پاس ہر طرح کی پیداوار کھینچ کھینچ کر آنے لگی یہاں تک کہ خلیفۂ وقت فضا میں اڑتے والے بادلوں سے کہنے لگا کہ چاہے تو پورب جائے چاہے یا پچھم جائے جس زمین پر تو برسے گا اس کا خراج بہرحال میرے خزانے ہی میں داخل ہوگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ دنیا کی لذتوں اور نعمتوں میں پھنس گئے اور عیش و عشرت کی زندگی گذارنے لگے۔ کسی دور میں یہ حالت کچھ اعتدال پر رہی تو کسی دور میں حد سے زیادہ تجاوز کر گئی۔

عہد نبوت کی سادہ زندگی کے بعد اس فراخی و کشادگی اور نعمت و آسائش کی زندگی میں معاشرے کا مبتلا ہو جانا تقاضا ہی تھا کہ اللہ کے کچھ صالح، خدا ترس اور اصحاب علم و فضل ایسے اٹھیں جو لوگوں کے دلوں سے دنیا کی زوال پذیر نعمتوں کی محبت کو نکال کر انکی آخرت کی دائمی نعمتیں یاد دلائیں۔ وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان، لو کانوا یعلمون۔ لہ

اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس کے سب سے پہلے داعی امام حسن بصریؒ ہیں اور ان کے بعد سے بہت سے صالح بندوں نے اسکی طرف دعوت دی چنانچہ ایسے لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جنہوں نے لوگوں کو اللہ اور یوم آخرت کی یاد اور دنیا سے بے رغبتی کی طرف بلایا اور لوگوں کے دلوں میں جذبۂ اطاعت خداوندی اور خوف آخرت کو بٹھایا۔

اسلام کے دیگر حقائق و معارف کی طرح اس چیز نے بھی باقاعدہ ایک ایسے علم و فن کا قالب اختیار کر لیا جو علم انسان کی تربیت کرے اور زندگی کے میدان میں ان کے لئے رہنما ثابت ہو اور اس راہ کے رہرو اللہ کی یاد اور اس کی

لہ ترجمہ: آخرت کی زندگی ہی اصل زندگی ہے اگر یہ لوگ سمجھ رکھتے۔

عبادت کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں اور اللہ کی مرضی اور ابدی سعادت کے گھر کو اپنے پیش نظر رکھیں۔

علوم تصوف میں علم تربیت و سلوک بلاشبہ اسلام کی روح اور اس کا مقصود ہے۔ اور بلاشبہ صوفیہ نے اس کے ذریعہ اصلاح نفوس اور ترقی کے وہ مدارج طے کئے جہاں تک دوسروں کی رسائی نہ ہو سکی اور بلاشبہ انھوں نے اس طرح لوگوں کے اندر عملی تبدیلی پیدا کر دی۔ لوگ فراخی کی اور آسودگی اور فوری سے اجتناب اور اللہ کی طرف حقیقی معنوں میں رجوع کرنے لگے۔ گرچہ اکثر ایسا ہوا کہ اسمیں مبالغہ اور غلو پیدا ہو گیا اور یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ یہ دعوتیں اپنے زمانے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ مثلاً خاموشی، تقلیل طعام، شب بیداری اور خلوت نشینی میں مبالغہ اور غلو سے کام لیا گیا۔ ان کام کی کی اصل اور ماخذ دین میں موجود ہے۔ چنانچہ خاموشی کی اصل لغویات سے اعراض ہے۔ اور تقلیل طعام کی بنیاد نفلی روزہ رکھنا ہے۔ اور شب بیداری کی بنا تہجد گذاری ہے۔ اور خلوت نشینی کی اصل لوگوں کو اذیت پہنچانے سے بچنا ہے۔ اگر ان کو مثلاً اپنانے میں لوگ اس حد کو پھلانگ نہ گئے ہوتے جس کو شارع علیہ السلام نے متعین کیا ہے تو پھر اس میں بھلائی ہی بھلائی تھی۔ لیکن صوفیہ کی یہ دعوت علم تربیت ہی کی حد پر نہیں رکی۔ اگر یہیں رک گئی ہوتی تو یہ اس کے حق میں بھی مفید ہوتا اور لوگوں کے لئے بھی بہتر ہوتا۔

لیکن انکی یہ دعوت ابتدائی ادوار کے بعد سادہ سادہ علم سلوک و تربیت سے تجاوز کر کے ذوق و وجدان کا گورکھ دھندا بن کر رہ گئی۔ بلکہ مزید اسمیں فلسفہ و منطق اور گذشتہ اقوام کے نظریات و خیالات کی آمیزش ہوئی۔ اس طرح سے دین میں وہ باتیں داخل ہو گئیں جن کا دین سے کوئی تعلق اور لگاؤ نہ تھا۔ اور ہر ملحد، دہریہ، اور غلط عقیدہ و نظریہ رکھنے والے کیلئے ایسے چور دروازے کھل گئے جن کے راستے تصوف، زہد، تقشف اور شاندار روحانی نتائج کے حصول کی دعوت و

ترغیب کے نام پر انھوں نے اس میں اپنی اپنی چیزیں داخل کیں۔ چنانچہ اس موضوع پر جو کچھ بھی لکھا اور کہا جاتا ہے وہ اس لائق ہے کہ اللہ کے دین پر گہری نظر رکھنے والے اور اسکو اپنی اصلی اور صاف ستھری شکل میں دیکھنے والے اس پر گہری تنقیدی نظر ڈالیں۔

اس کے بعد اس نظریہ کی عملی تشکیل کا دور آیا چنانچہ صوفیہ کے بہت سے فرقے اور گروہ پیدا ہوئے۔ ہر فرقہ اور گروہ اپنے طریقۂ تربیت میں دوسرے سے مختلف ہوتا۔ اور اس کے بعد سیاست اسمیں دخل انداز ہوئی تاکہ بوقت ضرورت ان تنظیموں کو آلۂ کار بنائے۔ پس کبھی تو ان گروہوں کی عسکری تنظیم اور کبھی مخصوص گروہوں کی طرح ان کی تنظیم عمل میں آئی یہاں تک کہ آج اسکی یہ صورت ہو گئی ہے کہ اصلی علم تصوف کا صرف ڈھانچہ باقی رہ گیا ہے۔ جس کے اندر تصوف کی لمبی تاریخ کے ہر قسم کے رنگ پائے جاتے ہیں۔ اور جسکی نمائندگی ہمارے زمانے کے مصری شیوخ طریقت اور ان کے مریدین کر رہے ہیں۔

اگر ممالک میں اسلام کی اشاعت اور اسے دور دراز گوشوں تک پھیلانے میں بلاشبہ تصوف اور سلوک کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ جہاں یہ پیغام انھیں صوفیہ کے ذریعہ ہی پہنچ سکتا تھا۔ جیسا کہ پہلے بھی اور آج بھی افریقہ کے شہری اور صحرائی علاقوں، اور ایشیا کے بھی اکثر حصوں میں ہوا ہے۔ اور ہو رہا ہے۔

بلاشبہ تربیت اور اصلاح کے سلسلے میں اصول تصوف کا بڑا حصہ ہے اور اس سلسلہ میں صوفیہ کے اقوال بھی بڑے موثر ثابت ہوتے ہیں لیکن اس میں غلط آمیزش نے ان بہت سارے فائدوں کو مسخ ہی نہیں بلکہ ختم کر کے رکھ دیا ہے۔

مصلحین کا فرض ہے کہ وہ ان گروہوں کی اصلاح کی فکر کریں۔ اور ان کی اصلاح سہل اور ———

نہ ستیزہ گاہ جہاں نئی

از راشد حامدی

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

تاریخ کے سرخ اوراق شاہد ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے لیکر آج تک یہ دنیا رزم گاہ حق و باطل رہی ہے تقریباً ہر دور اور ہر زمانہ میں یہاں معرکۂ خیر و شر گرم رہا ہے ہمیشہ حق و باطل، جابر و مجبور اور ظالم و مظلوم کے مابین کشمکش جاری رہی ہے باطل نے ہمیشہ ہی اپنی طاقت و قوت کے بل بوتے پر، حکومت و اقتدار کے نشہ میں، کثرت اولاد و اموال کے زعم میں حق کو مٹانے، اسے صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے اور اس کی آواز کو خاموش کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے بلکہ شیدائیان حق و صداقت اور حامیان خیر و فلاح باطل کی ہر کوشش کو ناکام بنانے کیلئے سر دھڑ کی بازی لگاتے رہے ہیں۔ تاریخ عالم کے صفحات پر یہ حقیقت ثبت اور بالکل عیاں ہے کہ حق و باطل اور خیر و شر کے ان معرکوں میں پہلی فتح تو عموماً باطل ہی کو ہوئی لیکن آخری اور ابدی کامرانی حق نے حاصل کی ہے۔

نیل کی موجیں شاہد ہیں کہ فرعون متکبر کو غرقاب ہونا پڑا اور موسیٰ اور ان کی قوم کو فرعونی ظلم و استبداد سے رستگاری نصیب ہوئی۔ گردش لیل و نہار گواہ ہے کہ نمرود کا نعرہ "انا و لا غیری"، کسی صدائے "لا الٰہ الا اللہ" میں گم ہو کر رہ گیا اور خلیل بت شکن کیلئے دہکتی ہوئی آگ کا الاؤ مہکتی ہوئی پھلواریوں کے گلزار میں تبدیل ہو گیا۔ کعبہ کے در و بام مہر بلب کسی سننے والے کے منتظر ہیں کہ کعبہ کے متولی اور سرداران قریش کو بے یار و مددگار محمدؐ کے آگے جھکنا پڑا اور لات و ہبل کے حصہ میں ذلت و رسوائی کا حصہ آیا۔ کوہ فاراں کی چوٹیاں شاہد ہیں کہ حق حق ہے اس کا بول بالا ہوا ہے اور جاء الحق وزهق الباطل ان الباطل كان زهوقا۔ وجعل كلمة الذين كفروا السفلى وكلمة الله هي العليا۔ انهم لهم المنصورون وان جندنا لهم الغالبون کی سنت کے مصداق باطل کو بھی بے پناہ طاقت و قوت، دولت و اقتدار اور نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والی سیادت و قیادت کے باوجود شکست و ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ تاریخ انسانی شاہد ہے کہ جب بھی باطل نے حق کو چیلنج کیا ہے حق نے آگے بڑھ کر اس چیلنج کو قبول کیا ہے اور اہل حق مردانہ وار میدان کارزار میں کود پڑے، جان دیدی پر پشت نہ دکھائی سر کٹا دیا لیکن سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا۔

یوں تو لیل و نہار ہمیشہ ہی شاہد رہے ہیں حادثات و واقعات

سے ٹکرا تے رہے ہیں لیکن دسویں محرم الحرام کو روئے زمین پر عزیمت و استقامت، قربانی و شہادت اور ایثار و جاں فروشی کا جو عظیم واقعہ رونما ہوا، چرخ نیلی فام آج تک اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر رہا ہے زمین و آسمان نے دیکھا کہ بہتر افراد کا قافلہ حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما کی قیادت میں باطل کی ٹڈی دل مسلح اور تربیت یافتہ افواج کے سامنے صف آرا ہو گیا۔

باطل پرستوں نے آپ کو سمجھانا چاہا۔ اے نواسۂ رسول! اے جگر گوشۂ فاطمہؓ اے بوترابؓ کے بیٹے! اگر آپ یزید کی بیعت پر راضی ہو جائیں تو ہم آپکو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے ورنہ یہ وسیع و عریض صحرا بھی آپکو پناہ نہ دے سکے گا عقل اور مصلحت نے مشورہ دیا کہ نادان مان جا کیونکہ اپنی جان کے پیچھے پڑا ہے بیعت کر لے اور گوشۂ عزلت میں بیٹھ جا تو اپنا حق ادا کر چکا لیکن آپ کے پاس ان سب باتوں کا ایک ہی جواب تھا۔

کیا غم ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہدے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

میدان کربلا کا ایک ایک ذرہ چیخ اٹھا، سورج قہر و غضب کی آگ برسانے لگا۔ زمین و آسمان تلملا کر رہ گئے، وقت کی رفتار ایک لمحہ کیلئے یہ روح خراش منظر دیکھنے کیلئے تھم سی گئی کہ کس طرح حضرت حسینؓ جگر گوشوں سمیت اپنے مقصد پر قربان ہو جاتے ہیں تاریخ اس واقعہ کو رقم نہ کر سکی اور وہ اس صفحہ کو سادہ ہی الٹ دیتی ہے۔

دوستو! غور کیجئے آخر آپکی عظیم قربانی کس مقصد کی خاطر تھی؟ آخر وہ کون سا عظیم مقصد تھا جس کے حصول کیلئے آپ نے اپنے آپ کو، اپنے جگر گوشوں کو شیر خوار بچوں کو اور اپنے بہتر ساتھیوں کو قربان کر دیا تھا؟ کیا آپکو جاہ و حشم کی خواہش تھی؟ کیا آپ حکومت و اقتدار کا منصب چاہتے تھے؟ نہیں! ہرگز نہیں!! نواسہ رسول ہونے کی حیثیت سے آپکو جو عزت و شرف حاصل تھا وہ کسی بھی بڑے سے بڑے منصب سے کم نہ تھا پھر کیا بات تھی جس کیلئے آپ نے اپنا اور اپنے خاندان والوں کا سر کٹانا پسند کر لیا لیکن سر جھکانا گوارہ نہ کیا۔

بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب امیر معاویہ کا لخت جگر یزید ابن معاویہ اپنے مصاحبین اور حاشیہ برداروں کی کوششوں سے تخت نشین ہو گیا اور عوام کی تائید و نصرت، غلبہ و اقتدار، قہر و غضب اور لالچ نے اسکی خلافت کو پائیدار و مستحکم کر دیا تو اس نے فرزند رسولؐ حسین ابن علی رضی اللہ عنہما سے بیعت کا مطالبہ کیا تا کہ وہ لوگوں کو یہ تاثر دے سکے کہ اولاد رسولؐ اور کبار صحابہؓ بھی اس کے ہم نوا اور حامی ہیں اور اس کی خلافت کو حق بجانب سمجھتے ہیں لیکن حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اسکے ہاتھ میں ہاتھ دینے سے انکار کر دیا اور اہل کوفہ کے اصرار و دعوت پر اپنے اہل بیت اور گنے چنے ساتھیوں کیساتھ کوفہ کی طرف چلے گئے لیکن اہل کوفہ نے اقتدار وقت کے لالچ اور دھمکیوں میں آ کر آپکا ساتھ چھوڑ دیا اور آپ میدان کربلا میں نہایت مظلومی کے ساتھ شہید کر دیے گئے لیکن جب ہم اس سانحہ کے اسباب و علل کا بنظر غائر مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی پشت پر دوسرے ہی عوامل کارفرما نظر آتے ہیں معاملہ صرف اتنا ہی نہیں تھا کہ کبار صحابہ اور دوسرے با صلاحیت افراد کی موجودگی میں یزید جو خلافت

کے لئے کسی بھی حالت میں موزوں و مناسب نہ تھا، خلیفہ بنا دیا گیا تھا بلکہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین تھا یزید کی تخت نشینی سے اسلامی نظام حکومت کا ڈھانچہ ہی بدل کر رہ گیا تھا اور اسلامی طرز حکومت کی جگہ قیصر و کسریٰ کی طرز حکومت نے لے لی تھی جس کو ختم کرنے اور روئے زمین پر خدائے واحد کی خدائی قائم کرنے کے لئے رسول مقبول ﷺ دنیا میں تشریف لائے تھے اور جنھوں نے اپنی زندگی اسی کام میں صرف کر دی تھی کہ خدا کے بندوں کو غیر اللہ کی غلامی سے نکال کر ایک خدا کے آگے سجدہ ریز کر دیں۔

چنانچہ نظام حکومت کی تبدیلی سے پہلی ضرب مسلمانوں کے اس حق انتخاب اور اسلام کے اس جمہوری نظام امارت پر پڑی، جس کی رو سے ایک حبشی غلام کو بھی تقویٰ کی بنا پر امیر بنایا جا سکتا ہے اور جس کی اطاعت ہر ایک پر واجب ہوتی ہے خواہ اس کا ماتحت سید اور قریشی ہی کیوں نہ ہو اور اسی دوسری ضرب اسلام کی اس روح پر پڑی جس سے سرشار ایک بدو بھی امیر المومنین کو برسر عام ٹوک دیتا تھا اور تلوار سونت کر کہتا تھا، "اے عمر اگر تجھ میں ذرا بھی کجی آئی تو میں تجھے اس تلوار سے سیدھا کر دوں گا" اور تیسری ضرب اسلام کی اس روح پر پڑی جس کے بل بوتے پر ایک بوڑھی عورت بھی امیر المومنین کا راستہ روک کر اپنا حق وصول کرنے میں خوف و جھجک محسوس نہ کرتی تھی اور امیر المومنین کی پیشانی پر شکن تک نہ آتی تھی۔

قطع نظر اس کے کہ فریقین میں کون حق پر تھا اور کون باطل پر، اگر غور کیا جائے تو یہ اصلاحات یا بگاڑ جو یزید کے تخت نشین ہونے سے اسلامی نظام حکومت میں پیدا ہو گئی تھیں وہ اس عمارت کے چولیں ہلانے کیلئے کافی تھی جس کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے مل کر تعمیر کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب آپ سے بیعت کا مطالبہ کیا گیا تو آپ نے صاف انکار کر دیا اور اس تبدیلی خلافت کو محض اس لئے قبول نہیں کیا کہ میری اس بیعت سے کہیں لوگ یہ جواز نہ نکال لیں کہ یزید کا ہر فعل شریعت کے مطابق ہے کیونکہ اس کی تائید جگر گوشہ رسول حسین ابن علی رضی اللہ عنہما نے کی ہے چنانچہ آپ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اگر آپ اس وقت اس تبدیلی نظام حکومت پر خاموش رہتے اور اس کی مخالفت نہ کرتے تو رہتی دنیا تک کیلئے یہ نظیر قائم ہو جاتی اور اس غلط نظام حکومت کو وجہ جواز مل جاتی۔

یہ چند وجوہات تھیں جن کی بنا پر آپ نے اتنی عظیم قربانی پیش کی تھی آپ کی قربانی صرف اور صرف اسلئے تھی کہ اسلام میں آمریت و ملوکیت اور کسرائیت کی کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن افسوس ہے فدایان حسین اور شیدائیان حق و صداقت پر کہ انھوں نے مغز کو چھوڑ کر پوست پر قناعت کر لی، ہر سال کروڑوں روپے تقریبات پر خرچ کئے جاتے ہیں کہیں جلسے منعقد ہوتے ہیں تو کہیں جلوس نکالے جاتے ہیں اور پھر نام نہاد فدایان حسین اپنی سینہ کوبی و اشکباری سے اپنے بدن کو زخمی کرکے اور طرح طرح سے اذیتیں دیکر اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں ہر سال یہ تاریخ ہمارے لئے نوحہ و ماتم سرائی اور نالہ و شیون کا پیغام لیکر آتی ہے اور ہم مگر مچھ کے آنسو بہا کر خاموش ہو جاتے ہیں حالانکہ جب انھیں لوگوں کو دعوت حق کی اشاعت و فروغ کیلئے آواز دی جاتی ہے اور کامرانی دو جہاں کا مژدہ سنا کر اسلام کی طرف بلایا جاتا ہے تو ان کے کان بہرے اور اعضاء و جوارح

ختم ہو جاتے ہیں اور طرح طرح کے حیلوں بہانوں تاویلات وتوجیہات کی آڑ لیکر اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں
مولانا ابوالکلام آزاد نے دسویں محرم الحرام کو کلکتہ کے جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے جو الفاظ کہے تھے وہ مسلمانوں کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں -

"اے عزیزان من! دود و الم کی یاک دعوتیں صرف اس روائی آب، تسلسل صدا اور ہنگامہ غوغائی کیلئے نہیں ہوتیں نقالوں اور ماتموں کے تمام سو ظہور میں آجائیں اور اگر ان کا یہی مقصد تھا تو اس کے لئے انسان کی کوئی خصوصیت نہ تھی کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوئے ہیں اور کتنے ہی جنگل شور وغوغا سے ہنگامہ زار ہیں الخ"

کیا آل رسول سے محبت کا یہی تقاضا ہے کیا آپکی قربانی مسلمانوں کو نوحہ ماتم سرائی میں ڈوب جانے کی دعوت دیتی ہے نہیں ہرگز نہیں بلکہ معاملہ نمونہ حاصل کرنے کا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے نظام حیات کی حفاظت کے لئے کس قدر ثابت قدمی استقامت و جرأت سے کام لینا چاہیئے - اور قبل اس کے کہ دین اسلام پہ کوئی آنچ یا خراش آئے آگے بڑھکر اسلام کی حفاظت و محافظت کیلئے اپنے آپ کو اپنے جگر گوشوں کو قربان کر دینا چاہیئے اور اگر کوئی حکومت غلط اقدام کرے تو اس پہ خاموش نہیں بیٹھنا چاہئے بلکہ اس کی روک تھام کیلئے سرگرم ہو جانا خواہ ہمیں اس مقصد کے حصول کیلئے کتنی ہی سختیاں برداشت کرنی پڑیں سہ
دستور کو جیاں کی تحریف پیش تھی نہ
دی شہادت اسد خطیب نے بحکم حیا دبی عسکری

شومئی قسمت آج ہندوستان میں جہاں کی مسلمانوں کی تعداد اسوقت کم وبیش پندرہ کروڑ ہے - امت مسلمہ کے جداگانہ قومی وطنی تشخص پر ضرب کاری لگائی جا رہی ہے اور ان کے تہذیب و تمدن اور احکام و قوانین کو یکساں سول کوڈ کی آڑ میں ختم کرنے اور اس کی روح نکالنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن مسلمان ہیں کہ خاموش تماشائی بنے بیٹھیں ہیں اور اپنے جیب و گریباں کو تار تار کر رہے ہیں آج ان کا خون پانی کی طرح بہایا جا رہا ہے ان کی ماؤں اور بہنوں کی آبرو ریزی کی جا رہی ہے لیکن انکی رگ حمیت ذرا بھی نہیں پھڑکتی ان کا تعلیمی اور معاشی استحصال کیا جا رہا ہے تاکہ وہ اتنے پست ہو جائیں کہ اپنے مقصد وجود کی آگہی، اپنے حقوق کی طلبی اور اپنی تہذیب و تمدن کی بقا کی بات بھی نہ کر سکیں وہ ذہنی طور پر اتنے پسماندہ ہو جائیں کہ اکثریت کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت کر سکیں وہ ہماری رگوں سے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لینا چاہتے ہیں وہ ہمارے منہ کا ایک نوالہ بھی چھین لینا چاہتے ہیں پھر ہم خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتے پھر بھی ہمیں ہوش نہیں آتا، کتنا تفاوت اور بعد ہے ہماری اور انکی زندگیوں میں، کہاں وہ اس بات کو برداشت نہ کر سکے کہ اسلام کا کوئی جز متاثر ہو جائے لاکھ یزید مسلمان تھا اور کہاں ہم ہیں کہ اسلام کو بیخ و بن کو اکھاڑ پھینکنے کی سازشیں کی جا رہی ہیں اور ہمارے کان پر جوں بھی نہیں رینگتی -

ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ چمن جس کو ہمارے اسلاف نے اپنے مقدس خون سے سینچا تھا جو کل تک عطر بیزیاں اور گل پاشیاں کر رہا تھا جس کی خوشبو اپنوں ہی کو نہیں بلکہ پوری انسانیت

تو معطر کر رہی تھی، آج اس پر خزاں کا تسلط ہوگیا ہے جس میں کل تک بلبلیں نغمہ ریز تھیں آج اس پر بوم و زاغ جیسے ناپاک پنجہ گاڑے ہوئے ہیں کاش ہم میں سے وہ نوجوان جو اہل بیت اور آل رسول سے محبت و عقیدت کے دعویدار ہیں اٹھیں اور اٹھ کر دنیا کو اسلام کا لافانی پیغام دنیا تک پہونچائیں اور لوگوں کے قلوب و اذہان شکوک و شبہات کی دبیز چادر کو چاک کر کے انھیں حقیقی اسلام سے روشناس کرائیں ؎

حرم کی پاسبانی صرف سجدوں سے نہیں ہوگی
کہ اب خاک زمین کربلا کچھ اور کہتی ہے!

(بقیہ صفحہ کا)

"یہ خدائے پاک کا احسان ہے" میں نے جواب دیا "اب آپ کہاں ہیں" یہ سوال بے ساختہ میری زبان پر آگیا۔

"سجاد صاحب آج کل پٹنہ میں لگے ہوئے ہیں ہماری رہائش آج کل گلزار باغ میں ہے۔ کسی دن ملنے کے لئے ہمارے یہاں ضرور آئیے گا"۔

"جی بہتر! موقعہ ملا تو ضرور آؤں گا!"

"آپ ضرور آئیں۔ میں آپ کا انتظار کروں گی" وہ بولیں "میں آپ کے قرآن کریم کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اس کا ذکر میں نے سجاد صاحب سے اکثر کیا ہے"۔

"میں آپکا بہت مشکور ہوں" سجاد صاحب بولے "آپ نے ہمارے تعلقات بحال کرا دئیے میری بیگم کو قرآن پاک پڑھا کر بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں"۔

"یہ صرف کلام پاک کا اعجاز ہے" میں نے کہا۔ "ورنہ من آنم کہ من دانم"۔

دونوں نے سر جھکا کر اس کا اعتراف کیا رخصت ہوئے سامان لدوا کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور گاڑی چل دی۔

شرائط ایجنسی

- ایجنسی کم سے کم پانچ رسائل پر دی جائیگی
- دس روپئے ایڈوانس جمع کرنے ہوں گے
- پانچ سے پندرہ پرچوں تک دس فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔ البتہ پندرہ سے زائد پر ۳۰ فیصدی کمیشن دیا جائے گا۔
- رسائل کی روانگی کا خرچ ادارہ برداشت کریگا البتہ وی پی اور رجسٹری کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔
- ہر مہینے کا بل باقاعدگی سے ادا کرنا لازم ہوگا

منیجر حیات نو جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ یوپی

ہر شہر میں حیات نو کے ایجنٹ مطلوب ہیں

مترجم زبیر احمد متعلم جامعۃ الفلاح

محمد احمد جمال صاحب سے ایک اہم انٹرویو

نبی اور رسول کا فرق

قرآن واحادیث کی روشنی میں

> احمد جمال مصر اخوان کے سرگرم کارکن صاحب طرز ادیب اور کئی اہم معرکۃ الآرا کتابوں کے مصنف ہیں اور ایک یونیورسٹی میں پروفیسر کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ موصوف کو اخوان سے تعلق کی بنا پر مصر سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ موصوف کی اکثر تصانیف اور تحقیقی مضامین موجودہ مسائل پر ہیں جن میں خصوصاً مستشرقین کے فتنوں کا سد باب کیا گیا ہے۔
> ادارہ

س (۱) نبی اور رسول میں کیا فرق ہے؟

س (۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب دوبارہ تشریف لائیں گے تو نبی ہونے کا دعویٰ کریں گے یا رسول ہونے کا؟

س (۳) کیا عورتیں بھی نبی ہو سکتی ہیں؟

جواب ۱: علمائے سلف کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ نبی اور رسول میں فرق ہے کہ نہیں۔ چنانچہ شرح طحاویہ میں مصنف نے لکھا ہے کہ علماء سلف متعدد فرق بتاتے ہیں جن میں سب سے واضح فرق یہ ہے کہ نبی کو حکم تبلیغ نہیں دیا جاتا اور اس کے برخلاف رسول جو شریعت ساتھ لے کر آتا ہے اس کو اسکی تبلیغ کا حکم دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

"وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ نے اخبار سماوی سے آگاہ کیا ہو اور ساتھ ساتھ حکم تبلیغ بھی دیا ہو تو وہ نبی اور رسول، دونوں ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسکو حکم تبلیغ نہ ملا ہو تو وہ صرف نبی ہوتا ہے، رسول نہیں۔ گویا ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہو سکتا۔"

تفسیر قرطبی کی جلد ۱۲ میں آیت "وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ" کے تحت فاضل مفسر لکھتے ہیں:

"کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں بعض رسول بھی ہوتے ہیں اور بعض رسول نہیں صرف نبی۔"

عقائد کی بیشتر کتابوں میں نبی اور رسول کے مابین فرق بیان کیا گیا ہے۔ نبی کی تعریف یہ ہے کہ جس کو شریعت تو ملی ہو لیکن اسکو حکم تبلیغ نہ ملا ہو اور رسول وہ ہے جسکو شریعت بھی ملی ہو اور اس کی نشر واشاعت کا حکم بھی ملا ہو۔ اسی قسم کی تعریف کو شیخ محمد علی الصابونی نے اپنی کتاب "النبوۃ والانبیاء" میں جگہ دی ہے۔ لیکن قرآن و حدیث کا بغور مطالعہ کرنے والا حقیقتاً نبی اور رسول کے درمیان کوئی فرق نہیں محسوس

کیا ہے۔[1]

کیونکہ قرآن نبی اور رسول دونوں کو یکساں طور پر یکساں ذمہ داریوں کا مکلف ٹھہراتا ہے۔ اس سے اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ انبیاء کو شریعت کی تبلیغ کا حکم نہیں ہوتا ہے اور نبوت ان سے خاص ہوتی ہے۔

پھر آخر اس سے کیا فائدہ ہوگا کہ انسان کو شریعت تو دی جائے پر اس کی نشر و اشاعت کا حکم نہ دیا جائے۔

ہم اپنے خیال کی تائید میں اولاً ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن میں محمد اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت نبی خطاب کیا گیا ہے۔

★ یا ایہا النبی حرض المومنین علی القتال۔

★ یا ایہا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیہم۔

★ یا ایہا النبی اتق اللہ ولا تطع الکافرین والمنافقین۔

★ یا ایہا النبی قل لازواجک۔

★ یا ایہا النبی قل لمن فی ایدیکم من الاسریٰ۔

★ یا ایہا النبی حسبک اللہ ومن اتبعک من المومنین۔

قرآن مجید میں دوسرے انداز سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں مخاطب کیا گیا ہے۔

★ وما کان لنبی ان یکون لہ اسریٰ۔

★ ما کان للنبی والذین آمنوا ان یستغفروا للمشرکین

★ ما کان علی النبی من حرج فیما فرض اللہ۔

قرآن مجید انبیاء و رسل کی مہمات اور ان کی ابتلاء و آزمائش کا ذکر کرتے ہوئے لفظ "نبی" کا استعمال بہ نسبت لفظ "رسول" زیادہ کرتا ہے۔ مثلاً

★ وکم ارسلنا من نبی فی الاولین۔

---

[1] اہل تفسیر کے درمیان اس میں کافی اختلاف رہا ہے کہ نبی اور رسول میں فرق کی نوعیت کیا ہے؟ آیا یہ دونوں ہم معنی الفاظ ہیں یا ان دونوں کے مرتبے یا ذمہ داری کی نوعیت کے لحاظ سے کوئی خاص اصطلاحی فرق ہے۔ ان دونوں لفظوں میں معنوی لحاظ سے جو فرق ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے۔ قرآن مجید کا غائر مطالعہ کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ نبی اور رسول دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں جیسا کہ سورۂ حج رکوع ۷ میں فرمایا گیا ہے۔

"ہم نے تم سے پہلے نہ کوئی رسول بھیجا اور نہ نبی مگر ......"

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ رسول کو شریعت دی جاتی ہے مگر نبی کو شریعت نہیں دی جاتی بلکہ سابقہ شریعت کو زندہ کرنے اور اسی طرف دعوت دینے کی ذمہ داری ڈالی جاتی ہے۔

مولانا مودودیؒ رقم طراز ہیں:۔

"زیادہ سے زیادہ جو بات یقین سے کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ نبی کی بہ نسبت خاص ہے یعنی ہر رسول نبی بھی ہوتا ہے مگر ہر نبی رسول نہیں ہوتا، یا بالفاظ دیگر انبیاء میں سے رسول کا لفظ ان جلیل القدر ہستیوں کے لئے بولا گیا ہے جن کو عام انبیاء کی بہ نسبت زیادہ اہم منصب سپرد کیا گیا تھا۔ اسی کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو امام احمدؒ نے حضرت ابو امامہ سے اور حاکم نے حضرت ابو ذر سے نقل کی ہے کہ نبی سے رسولوں کی تعداد پوچھی گئی تو آپ نے ۳۱۲ یا ۳۱۵ بتائی اور انبیاء کی تعداد پوچھی گئی تو آپ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی۔ اگرچہ اس حدیث کی سندیں ضعیف ہیں مگر کئی سندوں سے ایک بات کا نقل ہونا ان کے ضعف کو بڑی حد تک دور کر دیتا ہے۔ واللہ اعلم" ——— ادارہ

* وکاین من نبی قاتل معہ ربیون کثیر
* وکذالک جعلنا لکل "نبی" عدوا شیاطین الانس والجن۔
* وکذالک جعلنا لکل "نبی" عدوا من المجرمین۔
* یحکم بہا "النبیون" الذین اسلموا للذین ھادوا۔
* وما اوتی "النبیون" من ربہم
* ویقتلون "النبیین" بغیر الحق
* ویقتلون "الانبیاء" بغیر حق
* انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ۔

اسی طرح قرآن میں دوسری صفت "نبوت" بھی کثرت سے وارد ہے۔ اس کثرت سے صفت "رسالت" نہیں آتی۔

اگر ہم احادیث کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ قرآن کی طرح احادیث میں بھی رسل، مرسلین کے الفاظ، لفظ نبی یا انبیاء سے کم آئے ہیں مثلاً قول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مثلی ومثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً فاحسنہ واجملہ الا موضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ ویعجبون ویقولون ھلا وضعت ھذہ اللبنۃ؟ فانا اللبنۃ، وانا خاتم الانبیاء۔ (بخاری ومسلم)

پھر آپ ہی بتائیے کہ قرآن اور حدیث کی اتنی دلیلوں کے ہوتے ہوئے کیسے کہا جائے کہ نبی و رسول میں فرق ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نبی اور رسول کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایسی صفتیں ہیں جو ایک دوسرے کی لازم ملزوم ہیں کیونکہ رسول اسی معنی میں نبی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کے فرائض سے آگاہ کر دیا ہے۔ اور نبی اس معنی میں رسول ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنا پیغام پہونچانے کے لئے منتخب کر لیتا ہے لہذا

اگر لوگ ایمان لاتے ہیں تو ان کے حق میں بشیر ہوتا ہے۔ اگر نافرمانی کرتے اور کفر پر اصرار کرتے ہیں تو ان کے حق میں نذیر ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: ہمارے سامنے بہت ساری امتیں آئیں پس ہر ایک امت کا نبی چلنے لگا اور اس کے ساتھ اسکی امت کے کچھ لوگ بھی چلنے لگے۔ بعض انبیاء کے ساتھ ایک امت چلی اور بعض کے ساتھ ایک گروہ چلا، بعض کے ساتھ دس آدمی بعض کے ساتھ پانچ اور بعض تنہا رہے۔

جواب ۱ :- حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آخر میں آئیں گے تو کوئی نئی شریعت نہیں لائیں گے۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شریعت کو نافذ کرنے والے ہوں گے۔

جواب ۲ :- نبوت نساء کے قائل امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اشارت اتصال الٰہی خواہ کسی خبر کے ذریعہ یا بات کے ذریعہ، نبوت کہلاتی ہے۔ لہذا ابراہیم علیہ السلام کی زوجہ محترمہ حضرت سارہ علیہا السلام، مریم علیہا السلام ام موسیٰ علیہا السلام اور فرعون کی زوجہ سب کی سب نبیہ تھیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اسکے جواب میں لکھتے ہیں کہ بشارت کا پایا جانا یا کسی بات کا معلوم ہو جانا اسکی وجہ سے نبوت نظر نہیں آتی۔ اہلسنت والجماعت کا کہنا ہے کہ عورتوں میں نبوت نہیں ہے ان میں تو صرف صدیقات ہوتی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود کہا ہے: "وامہ صدیقۃ"۔ لہذا اگر ان میں ہوتیں تو صدیقہ کے بجائے نبیہ کہا جاتا۔ ابن کثیر اسکی تردید اس آیت سے کرتے ہیں:

"وما ارسلنا قبلک الا رجالا نوحی الیہم"

لکھتے ہیں کہ یہ آیت اس بات میں صریح ہے کہ نبوت صرف مردوں ہی میں رہی عورتوں میں نہیں رہی۔ جمہور علماء کا بھی یہی خیال ہے۔

(المسلمون ریاض سے ترجمہ)

مولانا ابوبکر اصلاحی
استاد جامعۃ الفلاح

علامہ ابن رشدؒ

ابن رشد کی ولادت

ابن رشد اندلس کے نہایت ہی مشہور معزز اور شریف خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان علم و فضل میں بہت ارفع و اعلیٰ تھا۔ کئی پشت سے اس خاندان میں عہدۂ قضا چلا آرہا تھا۔ اور اس خاندان کے افراد حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔

اندلس میں بہت سے عرب خاندان آئے اور آباد ہوگئے تقریباً ہر خاندان کے افراد یہاں موجود تھے۔ انھوں نے ایک ایک مقام، ایک ایک شہر اور ایک ایک صوبہ کو اپنے لئے خاص کرلیا تھا۔

ان قبیلوں میں برابر فسادات ہوتے رہتے تھے۔ منصور ابن ابی عامر ہشام ثانی کا وزیر تھا اس نے ہشام کو برطرف کرکے خلافت پر قبضہ کرلیا جب وہ برسر اقتدار ہوا تو اس نے ان فسادات کو روکنے کی یہ صورت نکالی کہ قبیلوں کی جانب نسبت کو قطعی ممنوع قرار دے دیا اور فوجی نظم و ترتیب میں بھی اپنے اس اصول کی سختی سے پابندی کی یہاں تک کہ قبیلہ وار کمپنیوں کے بجائے مشترک قبیلوں کی کمپنیاں قائم کیں۔ اس طرز عمل کی وجہ سے قبیلوں کے باہمی فسادات اندلس میں بالکل بند ہوگئے۔ اور اس کے بعد سے قبیلوں کی طرف نسبت کا طریقہ بھی متروک ہوگیا۔

ابن رشد کے خاندان کا حال پردہ [illegible] میں رہنے کی وجہ منصور بن ابی عامر کا یہی طرز عمل تھا اس لئے کہ جس زمانے میں ابن رشد کے خاندان کو شہرت حاصل ہوئی اس سے بہت پہلے ملک سے قبیلہ کی طرف نسبت کا رواج بالکل ختم ہوچکا تھا۔ بلکہ منصور بن ابی عامر کے عہد حکومت کے بعد سے یہ رواج عام ہوگیا تھا کہ اندلس میں جس شخص کی شہرت پہلے ہوتی اسی کی جانب اس خاندان کے افراد کی نسبت کی جاتی۔ اسی بنا پر ابن رشد کی نسبت اپنے دادا محمد بن رشد کی جانب کی جاتی ہے اور اسی نام سے یہ مشہور ہیں۔ ابن رشد کے خاندان میں ان کے دادا محمد بن رشد کو سب سے پہلے شہرت حاصل ہوئی، یہ مالکی مسلک کے امام تھے فقہ میں ان کو اتنا اعلیٰ و برتر مقام حاصل تھا کہ ۵۱۱ھ میں قرطبہ کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) اور قرطبہ کی (مشہور و معروف) جامع مسجد کے امام مقرر کئے گئے۔ انھیں اندلس میں فقہ مالکی میں امامت کا مقام حاصل تھا یوں تو انھیں تمام ہی علوم شرعیہ میں دسترس حاصل تھی لیکن فقہ اور علم فرائض میں خاص ملکہ حاصل تھا۔ ان کو شاہی دربار میں بھی بڑا تقرب حاصل تھا چنانچہ یہ اکثر ملکی معاملات میں دخیل ہوتے تھے۔

ابن رشد کے والد احمد بن محمد بن رشد ۴۸۷ھ میں پیدا ہوئے انھوں نے اپنی صلاحیت و قابلیت سے اپنے والد کا مقام حاصل کرلیا اور قرطبہ کے قاضی اور جامع مسجد کے امام مقرر ہوئے۔ ان کا انتقال ۵۶۳ھ میں ہوا اور اپنے پیچھے ایسا لائق فرزند چھوڑا جسے پوری دنیا میں شہرت و ناموری حاصل ہوئی اور اپنی تصنیفات کی بدولت ان کا نام قیامت تک زندہ رہے گا۔

ابن رشد کا نام محمد کنیت ابو ولید اور لقب حفید ہے ان کا سلسلہ نسب اس طرح ہے محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن احمد ابن رشد ۵۲۰ھ مطابق ۱۱۲۶ء میں اپنے دادا کی وفات سے ایک ماہ قبل قرطبہ میں پیدا ہوئے لیکن بعض مورخین کا کہنا ہے کہ ان کی پیدائش ۵۱۴ھ مطابق ۱۱۲۰ء میں ہوئی۔

ابن رشد کی تعلیم و تربیت

ابن رشد اندلس کے جس

خاندان میں پیدا ہوئے جسے کئی پشتوں سے علوم و فنون میں ممتاز مقام حاصل تھا اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کا بھی باقاعدہ نظم و انتظام کیا گیا۔ ان کے والد بھی صاحب درس تھے اور دادا بھی۔ یہی وجہ ہے کہ دور دور سے لوگ حصول علم کے لئے ان کے یہاں آتے تھے۔ بہرحال ابن رشد کی تعلیم کی ابتدا ہوئی چنانچہ انھوں نے وہاں کے رواج کے مطابق اپنے والد سے قرآن مجید اور موطا امام مالک کو حفظ کرنا شروع کیا اس سے فارغ ہونے کے بعد علوم زبان و ادب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں اتنا کمال پیدا کر لیا کہ بچپن ہی میں اشعار کہنے لگے۔

ابتدائی تعلیم کے فارغ ہونے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ حدیث و فقہ ابن رشد کا خاندانی علم تھا ان کے والد اور دادا قرطبہ کے قاضی اور جامع مسجد کے امام تھے۔ اس لئے حدیث و فقہ کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے اور اس دور کے اہل محدثین و فقہاء سے حدیث و فقہ کے علوم کی تکمیل کی۔ خاندانی علوم کو حاصل کر لینے کے بعد طب و فلسفہ کا شوق پیدا ہوا اور ان میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کی ہمسری کا کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح حدیث و فقہ میں اس وقت ملک میں ان کا کوئی مثل نہ تھا۔ غرضیکہ ابن رشد نے علوم و فنون میں اتنا کمال پیدا کیا کہ وہ فقہ، طب اور فلسفہ میں امام شمار کئے جانے لگے۔ اور اندلس کی علمی سوسائٹی میں انھیں ممتاز مقام حاصل ہو گیا۔

عہدۂ قضا

عبدالمومن نے ۵۴۲ھ میں ملثمین کی حکومت کو ختم کر کے مراکش پر قبضہ کر لیا اور اس کے بعد اندلس کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ عبدالمومن کو اس کی بڑی فکر تھی کہ حکومت کو جنگ تعلیم کی جانب سے جو بے توجہی رہی ہے اسے ختم کیا جائے۔ اندلس میں مدارس کے لئے الگ سے عمارتیں تعمیر نہیں کی جاتی تھیں بلکہ عام طور پر مساجد ہی سے درس و تدریس کا کام لیا جاتا تھا۔ عبدالمومن چونکہ روشن خیال تھا اس لئے اسے یہ طریقہ ناپسند تھا چنانچہ اس نے طے کیا کہ مدارس کے لئے مستقل طور پر عمارتیں تعمیر کی جائیں اور اشاعت علوم و تعلیم کی طرف پوری پوری توجہ دی جائے۔ اس مقصد کے لئے اسے اصحاب علم اور ماہرین تعلیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ابن رشد کو اس وقت کافی شہرت حاصل ہو چکی تھی اور وہ اس مقصد کو پورا کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ اس لئے سب سے پہلے عبدالمومن کی نظر انتخاب ان پر پڑی۔ چنانچہ اس نے ۵۴۸ھ مطابق ۱۱۵۳ء میں ابن رشد کو مراکش آنے کی دعوت دی۔ ابن رشد نے اس دعوت کو قبول کر لیا اور مراکش کا سفر کیا۔ وہاں پہنچ کر حسب سابق اپنے علمی و تحقیقی مشاغل کو جاری رکھا۔

۵۵۸ھ میں عبدالمومن کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا محمد جانشین ہوا، یہ نہایت ناکارہ بادشاہ تھا اس لئے صرف ۴۵ دن حکومت کر سکا۔ لوگوں نے اسے معزول کر کے اس کے چھوٹے بھائی یوسف کو بادشاہ بنایا۔ یوسف ایک طرف بڑا عالم و فاضل تھا اور دوسری طرف فن سپہ گری کا ماہر۔ گویا تیغ و قلم دونوں کا بادشاہ تھا۔ علوم دینیہ میں اس کی فضیلت کا یہ عالم تھا کہ صحیح بخاری اسے زبانی یاد تھی، قرآن مجید کا بہترین حافظ تھا، فقہ میں ماہرانہ بصیرت حاصل تھی۔ فن طب میں اس کی مہارت کمال کو پہنچی ہوئی تھی اور فلسفہ کا تو اسے خصوصی ذوق و شوق تھا۔ وقت کے بڑے بڑے فلاسفہ مثلاً ابن الطفیل وغیرہ اس کے خصوصی ہم نشین تھے۔ ابن الطفیل کو اس نے اپنے محکمۂ علمی کا افسر متعین کر رکھا تھا اور اسے یہ حکم دے رکھا تھا کہ ہر طرف سے علماء و فلاسفہ کو طلب کر کے علمی خدمتیں ان کے حوالے کی جائیں چنانچہ ابن الطفیل نے جن فاضل علماء اور ائمہ فن کو اکٹھا کیا ان میں ابن رشد بھی تھے۔

ابن الطفیل اور ابن رشد کے باہمی تعلقات نہایت ہی گہرے تھے کیونکہ ابن رشد کا ابن الطفیل سے دوگونہ رشتہ تھا۔ ابن الطفیل اور ابن رشد دونوں ابن باجہ کے شاگرد تھے اور خود ابن رشد ابن الطفیل کے بھی شاگرد تھے اس لئے ابن رشد کے علم و فضل اور صلاحیتوں سے ابن الطفیل اچھی طرح واقف تھا۔ اور اسے ابن رشد سے بڑی بڑی توقعات وابستہ تھیں

اسی حسن ظن کی بنا پر ابن الطفیل نے ابن رشد کو یوسف بن عبدالمومن کے دربار تک پہنچایا۔

یوسف کے دربار سے وابستگی کے بعد ابن رشد کی دنیوی ترقی کا دور شروع ہوا۔ یوسف ان کی نہایت قدر و منزلت کرتا تھا۔ ۵۶۵ھ مطابق ۱۱۶۹ء میں انھیں اشبیلیہ کا قاضی مقرر کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اشبیلیہ میں سکونت اختیار کی۔ ۵۷۸ھ/۱۱۸۲ء میں ابن الطفیل کی وفات ہوئی تو یوسف نے ابن رشد کو مراکش بلا کر اپنا طبیب خاص مقرر کیا اور اسی سال محمد بن مغیث قاضی قرطبہ نے وفات پائی تو انھیں قرطبہ کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کیا۔ یہ ان کی ترقی کا انتہائی منصب تھا جس پر ان کے باپ دادا پہلے سرفراز ہو چکے تھے اور اپنی صلاحیت و لیاقت کی بنا پر جس کے وہ بہت پہلے سے حقدار تھے۔

۵۸۰ھ میں یوسف بن عبدالمومن کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے بعد اس کا بیٹا یعقوب منصور تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔ یہ بہت بڑا عالم و فاضل اور متشرع بادشاہ تھا۔ اسکی دینداری کا یہ عالم تھا کہ پنج وقتہ نماز باجماعت شہر کی مسجدوں میں پہنچ کر ادا کرتا تھا۔ فقہ و حدیث میں اسے اچھی خاصی مہارت حاصل تھی اس نے اپنے زمانے کے فقہاء کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ کسی امام یا مجتہد کی پیروی نہ کریں بلکہ جو فیصلے کریں وہ اپنے اجتہاد سے کریں۔ عدالتوں کے قاضیوں کو حکم تھا کہ قرآن و حدیث اجماع و قیاس سے فیصلے کریں نہ کہ کسی امام یا مجتہد کی فقہ کے مطابق۔

منصور چونکہ علم دوست و علم پرور تھا اس لئے اس نے ابن رشد کی اس درجہ قدر و منزلت کی جس کے وہ صحیح معنوں میں مستحق تھے۔ دنیوی ترقی کے انتہائی مدارج پر وہ یوسف کے دور حکومت ہی میں پہنچ چکے تھے۔ منصور نے انھیں اپنی ندیمی کا شرف بھی بخشا۔ اپنے دور حکومت کے اوائل میں منصور ابن رشد سے علمی مسائل پر بحث و گفتگو کرتا۔ منصور سے ابن رشد کی بے تکلفی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ اکثر منصور کو "تسمع یا اخی" (اے بھائی سنو) کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

معاصرت کا فتنہ

اپنے زمانے میں اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں والے علماء و فضلاء ماہرین فن اور اصحاب قلم کی موجودگی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور جن کی تائید و حمایت کر کے دین کی بڑی سے بڑی خدمت انجام دی جا سکتی ہے مگر برا ہو معاصرت کا کہ یہ فتنہ ذہن و دماغ کو ماؤف کر کے اپنے ہی دین کی خدمت کرنے والوں کے مقابل میں لا کھڑا کرتا ہے اور دینی کاموں کی راہ میں یہ روک بنا دیتا ہے۔ معاصرت کے جذبے کو اس سے بڑی تسکین ملتی ہے کہ خادمان دین کا دینی کام بند ہو جائے، ان کی زبان و قلم پر تالے لگ جائیں، ان کے جسم کو قید و بند کے حوالہ کر دیا جائے۔

ابن رشد جیسا انسان جو صلاحیت علم و فضل اور دنیائے علم و قلم کا بادشاہ اس فتنہ کی زد سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا۔ چنانچہ حاسد معاصرین نے بادشاہ سے ابن رشد کی شکایتیں کر کے اسے بدظن کر دیا۔ جس کے نتیجے میں بادشاہ نے انھیں جلاوطن کر کے قرطبہ کے قریب بمقام لوسینا بھیج دیا جہاں وہ غربت و فلاکت میں زندگی بسر کرتے رہے۔

رہائی اور وفات

حق پسند لوگ ہر دور میں رہتے ہیں۔ اور اپنی حق پسندی کی وجہ سے حق و انصاف کی بات کہنے سے نہیں چوکتے۔ چنانچہ ایسے ہی حق پسند انصاف دوست مورخین نے شہادت دی کہ ابن رشد مظلوم ہیں اور ان پر جو تہمت لگائی گئی ہے وہ غلط اور فضول ہے چنانچہ منصور نے تحقیقات کرائیں، ابن رشد کی بے گناہی ثابت ہوئی اور وہ رہا کر دیئے گئے۔ اب وقت آیا تھا کہ ابن رشد اپنے علم و فضل اور کمال و مہارت کی وجہ سے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے اور جلاوطنی و فلاکت کے بعد خوشحالی و فارغ البالی سے ہمکنار رہتے مگر موت نے بے دردی سے [illegible] موقع نہ دیا اور رہائی کے ایک سال کے بعد [illegible] بیمار ہوتے اور وفات

ہو گئے۔ ان کی تاریخ وفات جمعرات ۹ صفر ۵۹۵ھ مطابق [illegible] ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ ان کی وفات ۵۹۰ھ کے دوران میں ہوئی۔

اولاد

یوں تو ابن رشد نے متعدد اولادیں چھوڑیں لیکن ان میں دو بہت مشہور ہوئیں۔ بڑے بیٹے کا نام محمد اور کنیت ابو القاسم تھی۔ یہ بہت ذہین تھے، حافظہ بھی نہایت قوی تھا۔ فقہ و حدیث سے دلچسپی تھی۔ اور اس میں بڑا اونچا مقام حاصل کیا۔ انھیں قضا کی خدمت سپرد کی گئی اور انھوں نے اسے بڑی دیانت داری کے ساتھ انجام دیا۔ ان کی وفات ۶۲۲ھ میں ہوئی۔

دوسرے بیٹے کا نام محمد اور کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ انھیں طب سے دلچسپی تھی، چنانچہ اس میں بڑا نام پیدا کیا۔ یہاں تک کہ ناصر کے دربار میں انھیں طبیب خاص کے عہدے پر سرفراز کیا گیا۔

اخلاق و عادات

ابن رشد حلیم و بردبار، حسین و سنجیدہ، فیاض و سخی اور رحیم و خلیق انسان تھے۔ وہ کبر و غرور، تملق و چاپلوسی اور رشوت ستانی سے کوسوں دور تھے۔ مدتوں عہدہ قضا پر مامور رہے لیکن کبھی اپنے عہدے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ شاہی تقرب سے اپنی ذات کو چھوڑ کر دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرائیں۔ محتاجوں اور بیکسوں کی دستگیری کی، یتیموں اور بیواؤں کی سرپرستی کی۔

اخلاق کی بلندی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک شخص نے بھرے مجمع میں سخت و سست کہا اور اہانت کی تو اس پر بجائے برافروختہ ہونے اور انتقام لینے کے الٹے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی بدولت انھیں اپنے علم و صبر کو آزمانے اور اپنی اصلاح کرنے کا موقع ملا۔ اور اس کے عوض میں اسے کچھ روپیہ عطا کیے۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ تلقین بھی کی کہ دوسروں کے ساتھ ایسا نہ کرنا کیونکہ ہر شخص میرے ہی جیسا نہیں

ہو گا لہٰذا تمہیں گزند پہنچ سکتا ہے۔

علم سے شغف کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت کتابوں کے مطالعہ میں منہمک رہتے۔ رات رات بھر کتب بینی کرتے رہتے۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ زندگی بھر میں صرف دو راتیں ایسی گذری ہیں جن میں وہ مطالعہ کتب سے باز رہے۔ ایک شادی کی رات اور دوسری وہ رات جس میں ان کے باپ نے وفات پائی۔

تصنیفات

ابن رشد کو فلسفہ، علم کلام، طب، فقہ، اصول فقہ، نحو اور علم ہیئت میں درجہ کمال حاصل تھا۔ مختلف علوم و فنون میں ان کی بیشمار تصنیفات ہیں۔ بعضوں کا کہنا ہے کہ ان کی اہم تصنیفات کی تعداد ساٹھ ہے۔ ایک روایت کے مطابق ان کی تصنیفات دس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ ان کی مشہور و معروف کتاب بدایۃ المجتہد فقہ میں بے مثال تصنیف ہے جو اجتہاد کا ذوق پیدا کرتی ہے۔

دل نہ ویران ہو جائے

صاحب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ناصر الملک پیر محمد خان اتالیق اور خان اعظم کوکلتاش کو حضرت شیخ جمال الدین سے بہت عقیدت تھی۔ بارہا انھوں نے چاہا کہ مال و جاگیر دنیوی میں سے کچھ قبول کریں لیکن حضرت نے انکار کیا اور فرمایا کہ گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں دل ویران نہ ہو جائے۔ عرفی نے کیا خوب کہا ہے ؎

من از قریب عمارت گدا شدم ورنہ
ہزار گنج بہ ویرانۂ دل افتادست

ہائی لینڈز

رحمت علی صابرؔ

سنہ ۱۹۳۶ء میں ٹریننگ ختم کرنے کے بعد سپرنٹنڈنگ انجینیر ایسٹ بہار سرکل کے دفتر میں بطور پرنٹس ڈرافٹسمین ملازم ہوا۔ یہ دفتر ایک ہنگامی منصوبے کے تحت معرض وجود میں آیا تھا جس کا کام سنہ ۱۹۳۴ء کے قیامت خیز زلزلے کی تباہ کاریوں سے متاثرہ سرکاری عمارات اور پبلک املاک کا سروے کرکے تعمیر و مرمت کا تخمینہ گورنمنٹ کو پیش کرنا تھا۔

کچھ عرصہ تک تمام اسٹاف بھاگلپور کچہری اسٹیشن کے بالمقابل ایک باغ میں خیمہ نشین رہا۔ پھر دریائے گنگا کے کنارے ایک ہندو وکیل شو چرن سنہا کی وسیع و عریض کوٹھی میں منتقل ہو گیا۔ کیمپ کی زندگی کو خیرباد کہہ کر سب نے شہر میں سر چھپانے کے لئے جگہ ڈھونڈی۔ میرے دو تین ساتھیوں نے بھی شاہ گنج میں چھوٹا سا مکان کرائے پہ لے لیا اور کھانا پکانے کیلئے ایک ملازم رکھ لیا اب ہم صبح کو کھانا کھا کر چلے جاتے اور شام کو چار بجے واپس آجاتے۔

کچہری روڈ سے دفتر جاتے وقت ایک بلند و بالا کوٹھی راستے میں پڑتی تھی۔ جو آرائش و زیبائش کے لحاظ سے اردگرد کی تمام کوٹھیوں میں ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ وسیع و عریض لان، پھولوں سے لدی ہوئی روشیں اور ہرے بھرے درختوں سے جھانکتی ہوئی سرخ ٹائیلوں کی پرشکوہ عمارت کوٹھی کے مین گیٹ پہ سنگ مرمر کی تختی پر سیاہ حروف میں "ہائی لینڈز" کندہ تھا ہمارا دفتر اس کوٹھی سے کوئی چالیس پچاس گز آگے تھا۔

جب کام سے دل اکتا جاتا، حالانکہ کام بہت مختصر سا تھا، تو ہم چائے پینے کیلئے کینٹین میں آ بیٹھتے جو لب سڑک دفتر کے دائیں ہاتھ واقع تھی۔ وہاں چائے پیتے ہوئے اکثر میں نے شام کو ایک وجیہ صورت گورے چٹے نوجوان کو ایک حسین و جمیل یورپین لیڈی اور ایک تین چار سالہ گڑیا سی لڑکی کے ہمراہ کوٹھی سے بغرض سیر و تفریح نکلتے دیکھا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نوجوان کا نام سجاد حسین ہے جو ڈسٹرکٹ کورٹ کے نامی گرامی بیرسٹر ہیں۔ اور یورپین لیڈی ان کی بیوی اور گڑیا نما لڑکی ان کی بیٹی ہے ولایت سے بیرسٹری پاس کر کے آتے وقت ایک بیگم بھی ہمراہ لے آئے تھے۔ پٹنہ کے مشہور و معروف وکلا سر علی امام اور حسن امام نے یورپین بیگمات لاکر طرح ڈال دی تھی۔ اب جو کوئی بھی

اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں ولایت جاتا۔ ایک آدھ ولایتی بیگم اپنے ہمراہ ضرور لاتا۔

کچھ دنوں بعد ایک خوش رو کوٹھی سے دودھ وغیرہ لینے کے لئے کینٹین میں آنے جانے لگا۔ آدمی پڑھا لکھا اور ملنسار تھا۔ اس لئے میری جلد ہی اُس سے دوستی ہو گئی۔ اس کا نام صغیر احمد تھا۔ صغیر صاحب بیرسٹر صاحب کے ٹائپسٹ اور نجی خط و کتابت کے انچارج تھے اور ان کے پاس کوٹھی میں رہتے تھے۔ جب کبھی میاں بیوی زیادہ مصروف ہوتے تو وہ اس گڑیا سی لڑکی کو، جس کا نام لیلیٰ تھا، سیر کرانے کے لئے آتے اور ہم بڑی دیر تک اُس سے بچوں کی سی باتیں کر کے دل بہلایا کرتے۔

باتوں باتوں میں صغیر نے بیرسٹر سجاد حسین، ان کی اہلیہ اور خاندان کے دیگر افراد کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ ایک دن صغیر کہنے لگا کہ سجاد صاحب کے والدین بھی اپنے گاؤں سے کوٹھی میں رہنے کے لئے آگئے ہیں پھر ایک دن شام کو میں نے ادھیڑ عمر کے ایک بزرگ کو شرعی پاجامہ، اچکن اور ٹوپی اور سفید براق کرتے میں ملبوس کوٹھی سے نکلتے دیکھا۔ یہ سجاد صاحب کے ابا جان تھے۔ چائے پیتے ہوئے صغیر کوٹھی کے مکینوں کے طرز زندگی پر تبصرہ شروع کر دیتا۔ ایک دن اس نے بتایا کہ سجاد صاحب کی ایک بیوہ بہن بھی یہاں آگئی ہے وہ کسی مقامی اسکول میں ہیڈ مسٹریس ہے۔

دن اسی طرح گزرتے رہے مجھے اُس خاندان سے نہ جانے کیوں دل چسپی سی ہو گئی تھی۔ حالانکہ میری ان سے کوئی رشتہ داری نہ تھی ہم وطنی کا تعلق نہ تھا۔ سوسائٹی میں مقام و مرتبہ میں بھی ان کا ہم پلہ نہ تھا۔ براہ راست اُن سے ملاقات نہ تھی۔ پھر بھی بلا ارادہ میں صغیر سے کرید کرید کر ان کے بارے میں معلومات فراہم کرتا اور وہ بھی نت نئی داستان سناتا اور میں ہمہ تن گوش ہو جاتا یہ میرا روز مرہ کا معمول تھا۔

ایک دن صغیر نے آتے ہی کہا "آج تو صاحب غضب ہو گیا۔ بیگم صاحب نے صاحب کی عدم موجودگی میں ان کی بہن اور ماں باپ کو گھر سے نکال دیا ہے۔"

"گھر سے نکال دیا؟" میں نے بھونچکا سا ہو کر کہا "یہ تم کیا کہتے ہو؟!!"

"سچ ہی تو کہہ رہا ہوں" وہ بمشکل اپنے جذبات پر قابو حاصل کرتے ہوئے بولا "جب سجاد صاحب کچہری سے واپس آئے تو ماں باپ کو نہ پا کر بیگم صاحب سے پوچھا: "امی ابا کہاں ہیں۔ نظر نہیں آتے؟"

"میں نے انھیں گاؤں بھیج دیا" بیگم صاحب کا جواب تھا۔

"گاؤں بھیج دیا ــــ مگر کیوں؟" سجاد صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"میرا مکان کوئی سرائے یا مسافر خانہ تو ہے نہیں۔ جو ایرا غیرا چاہے بوریا بستر اٹھائے یہاں ڈیرے ڈال کر بیٹھ جائے ....."

"مگر وہ تو میرے ماں باپ تھے: غیر نہیں تھے پھر میں نے انھیں تمہارے مشورے ہی سے بلایا تھا" صاحب آزردگی سے بولے

"یہ صحیح ہے مگر میں انھیں مستقل طور پر یہاں فروکش ہونے کی اجازت نہیں دے سکتی تھی اس لئے واپس بھیج دیا۔"

ہارے ہوئے جواری کی طرح سجاد صاحب کچھ دیر تک جرح قدح کرتے رہے پھر اس طرح خاموش ہو گئے جیسے کہ یہ کوئی خاص بات ہی نہ ہو

صغیر اپنے جذبات کی رو میں کہہ رہا تھا کہ "سچ تو یہ ہے کہ بیگم صاحبہ کی بدسلوکی میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ کاش کہ میں ان کا ملازم نہ ہوتا....."

اس طرح کوئی میری بہن اور ماں باپ کو گھر سے نکال کے دیکھتا تو اسے معلوم ہو جاتا کہ غیرت مند بھائی اور بیٹے کے جذبات کو چھیڑنا کتنا مہنگا سودا ہوتا ہے۔"

جب سجاد صاحب نے اسے معمولی واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ "تو ہمارا اتنا غصہ فضول ہے۔" میں نے اس کے غصے کو فرو کرنے کی نسبت سے کہا۔ "ولایتی بیگم سے اور کیا امید ہو سکتی ہے۔ وہ جہاں رہیں گی تنہا رہیں گی رشتے داروں کا وہاں گزارہ مشکل ہے۔"

"یہ بھی سچ ہے" وہ کہنے لگا "مگر انھیں ولایت سے بیوی لانے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ان کے اپنے گھرانے میں ایک سے ایک حسین اور تعلیم یافتہ لڑکیاں ہیں مگر اسکرٹ پہنے اور بے نقاب پھرنے والی میمیں نہیں۔"

اس واقعہ کے چند روز بعد صغیر میاں مجھے تلاش کرتے ہوئے دفتر میں آ گئے۔ میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ کینٹین میں آ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا۔ "ننھی لیلیٰ کے لئے ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے جو اسے اردو اور حساب پڑھا سکے۔ پہلے ایک مولوی صاحب یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ مگر وہ ایک ہفتے کی چھٹی لیکر جو گاؤں گئے ہیں تو واپس نہیں آئے اس لئے میرا خیال ہے کہ تم یہ خدمت اپنے ذمے لے لو تو بہتر رہے گا۔"

میں کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر حامی بھر لی اور شام کو دفتر کے بعد اس کے ہمراہ اس دیدہ زیب کوٹھی میں انٹرویو کیلئے جا پہنچا۔ میاں بیوی میرے اندازے کے مطابق کچھ کھنچے کھنچے سے لگے پھر بھی انھوں نے میری تعلیم اور خاندان کی چھان بین کے بعد اگلے دن سے آنے کا وعدہ لے لیا۔ مشاہرہ بیس روپے طے ہوا اور شام کو پانچ بجے سے چھ بجے تک ٹیوشن کا وقت مقرر ہوا۔

میں اگلے دن سے باقاعدہ لیلیٰ کو پڑھانے کیلئے جانے لگا۔ یہ ننھی سی لڑکی بے حد ذہین اور ہوشیار تھی تعلیم کے دوران ایسے ایسے سوال پوچھ بیٹھتی کہ میں بغلیں جھانکنے لگتا۔ وہ انگریزی بڑے پیارے لہجے میں بولتی تھی البتہ اردو میں تو وہ شاہی انداز تھا۔ جو اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملا تھا۔ وقت بے وقت سجاد صاحب اور کبھی کبھی ان کی بیگم صاحبہ میرے پاس ہی برآمدے میں آ بیٹھتے۔ شاید میرے طرز تدریس کو جانچنا چاہتے ہیں میں نے دیکھا کہ سجاد صاحب تو بے حد مطمئن تھے۔ البتہ بیگم صاحبہ کے مزاج میں ذرا تندی کا عنصر تھا

کوئی ڈیڑھ ڈھائی ہفتے بعد میں ٹیوشن کے لئے حاضر ہوا تو کوٹھی کے لان میں ساز و سامان بکھرا پڑا تھا اتنے میں بیگم صاحبہ نکلیں اور کہنے لگیں "بابو آج کوٹھی میں سفیدی ہو رہی ہے۔ اسلئے لیلیٰ کو چھٹی دے رہی ہیں۔ کل سے سلسلۂ تدریس شروع کیجئے" میں لوٹ آیا اور آتے ہی دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے کا پروگرام بنا کے شاہ گنج پہونچا۔ اچھوت کنیا نام کی پکچر لگی ہوئی تھی اور سنیما ہال پر بے حد ہجوم تھا۔ میں ٹکٹ لینے کیلئے کیوں میں کھڑا تھا۔ ہر طرف سے ریلے پہ ریلا پڑ رہا تھا کہ دفعتاً مجھے صغیر نظر آیا۔ وہ بھی متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں نے وہیں کیو میں کھڑے کھڑے اسے آواز دی۔ وہ دوڑ کر میرے پاس آیا اور آتے ہی بولا "میں آپ کو تلاش کرتے کرتے آپ کے گھر پہونچا تو معلوم ہوا کہ آپ سنیما دیکھنے گئے ہیں۔ اس لئے میں سیدھا یہیں چلا آیا۔"

"مگر میری تلاش کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی۔" میں نے پوچھا۔ "بیگم صاحبہ نے خود ہی مجھے آج کی چھٹی دے دی تھی۔ کہ گھر میں سفیدی ہو رہی ہے"

"یہ سفیدی ہی تو بربادی کا باعث بن گئی۔"

"جی میں نے اپنے اسکول کے زمانے ہی میں پڑھ لیا تھا۔" "عربی زبان سمجھ لیتے ہیں آپ!" انھوں نے پوچھا "جی ایک حد تک ــــ ویسے میرے پاس مترجم قرآن شریف ہے۔"

کیا انگریزی میں بھی کوئی قرآن پاک ہے؟" انھوں نے اشتیاق بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "اب تو قرآن پاک کا دنیا کی تقریباً ہر مروجہ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔"

"ہو سکے تو مجھے انگریزی میں کسی مستند یا مترجم کا قرآن پاک لا دیجئے میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں" یہ کہہ کر انھوں نے مجھے سو روپے کا نوٹ دے دیا۔

دوسرے دن میں علامہ عبد اللہ یوسف علی کا Holy Quran لے کر گیا۔ بیگم صاحبہ نے بڑے احترام کے ساتھ اسے میرے ہاتھ سے لیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

اب موقع بموقع مجھ سے قرآن شریف کے متن اور ترجمہ پر تبادلہ خیال کرنے لگیں۔ قرآن خوانی اور اس کے معانی پر بحث کرنے میں میری حیثیت مبتدی کی سی تھی۔ پھر بھی میں اردو ترجمہ شدہ قرآن پاک کا باقاعدگی سے مطالعہ کرکے جاتا اور کافی دیر تک انھیں مطالب اور معانی سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا۔ ان کا شوق مطالعہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اب لیلیٰ کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ مجھے بیگم صاحبہ کو بھی پڑھانا پڑتا اور اس میں مجھے ایک قسم کی راحت سی محسوس ہوتی تھی، ایک قسم کا قلبی سکون۔

ایک دن میں نے انھیں طہارت۔ وضو اور نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا اور اس کے فوراً بعد میں اس تبدیلی پر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ باقاعدگی سے پنجوقتہ نماز پڑھنے لگیں رمضان شریف میں انھوں نے بڑی پابندی سے روزے رکھے۔

کچھ دنوں بعد ہمارے دفتر کی مقررہ میعاد ختم ہو گئی اور میں بادل ناخواستہ ملازمت کی تلاش میں بیگم صاحبہ سے رخصت ہو کر پٹنہ چلا آیا۔ اور جلد ہی مجھے ریلوے میں گارڈ کی ملازمت مل گئی۔ ایک دن شاید ۱۹۴۳ء کا آغاز تھا۔ میں گاڑی چلانے کے لئے بریک سے باہر نکلا تو ایک صاحب نے آگے بڑھ کر کہا "گارڈ صاحب ایک منٹ رکیں۔ میرا سامان آرہا ہے" میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے سامنے سجاد صاحب تھے۔ انھوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملا کر خیریت دریافت کرنے لگے اتنے میں قلی ڈبے میں سامان لادنے آگئے۔ ان کے پیچھے پیچھے فیروزی ساڑی میں ملبوس ایک بیگم آرہی تھیں۔ قمیص شلوار پہنے ایک آٹھ نو سال کی لڑکی اٹیچی اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ یکا یک سجاد صاحب بولے "لیلیٰ بیٹی اپنے ماسٹر صاحب سے ملو۔"

وہ لڑکی حیرت بھری نگاہوں سے مجھے کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ گارڈ کی یونیفارم نے اسے شک وشبہ میں ڈال رکھا تھا پھر وہ بے اختیار میری طرف بڑھی اور جھک کر سلام کیا میں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ فرط مسرت سے اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا پھر ساڑی میں ملبوس بیگم صاحبہ نے السلام علیکم کہہ کر مجھے اپنی طرف مخاطب کر لیا میں حیران رہ گیا یہ وہی بیگم صاحبہ تھیں تر و تازہ پھول کی طرح شگفتہ چہرہ پھر مسکرا کر بولیں "آپ گارڈ بن گئے ہیں یہ مجھے معلوم ہی نہ تھا۔"

بقیہ صفحہ [illegible] پر

واقعہ سے مشتعل ہو کر تم نے جس وحشیانہ پن کا ثبوت دیا ہے وہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ مستقبل کا فیصلہ تو عدالت ہی کرے گی مگر فوری فیصلہ اسی وقت سن لو اس مکان کی رجسٹری میرے نام سے ہے۔ اور آج کے واقعہ کے بعد سے میں تمہیں کسی حال میں بھی اس مکان میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ آپ اپنا ذاتی سامان اٹھائیں اور فوراً میرا مکان خالی کر دیں۔ سجاد صاحب نے یہ فیصلہ خاموشی سے سنا اور مجھے حکم دیا کہ جو سامان بیگم صاحبہ تمہیں بتائیں باہر نکال کر رکھو تو میں ابھی آتا ہوں یہ کہہ کر وہ موٹر میں چلے گئے کوئی آدھ گھنٹے بعد آئے تو دو ٹرک ان کے ساتھ تھے سامان اٹھا کر ٹرکوں میں لادا پھر مجھے محبت سے بلا کر دو مہینے کی تنخواہ دے کر بولے مجھے ضرورت پڑی تو تمہیں دوبارہ بلواؤں گا۔ فی الحال اپنی ملازمت ختم سمجھو یہ وہ موٹر میں سوار ہو گئے۔ ٹرک پہلے ہی ان کے بتائے ہوئے پتے پر روانہ ہو گئے تھے۔

وقت رخصت لیلیٰ کی بے چارگی قابل دید تھی۔ وہ ننھی سی جان حیران تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ سوچ رہی تھی، امی کے پاس رہوں کہ ابا کے ساتھ جاؤں۔ انھوں نے بیٹی کو پیار کیا۔ اور پھر موٹر اسٹارٹ کر دی۔ بیگم صاحبہ نے چیخ کر کہا "میرا ماہانہ خرچ بغیر یاد دہانی کے مجھے ملتا رہنا چاہئے"۔ "بہت بہتر" سجاد صاحب نے جواب دیا اور ساتھ ہی محبت پدری نے کہا "لیلیٰ کا خیال رکھنا"۔

میں یہ روداد سن کر بھونچکا سا رہ گیا۔ سینما بینی کا شوق ختم ہو چکا تھا۔ اپنے دوستوں سے ضروری کام کا بہانہ کر کے میں صغیر کے ساتھ چلا آیا راستے بھر اچھے میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات کے اس الم انگیز انجام پر خیال آرائی کرتے ہوئے گھر پہنچ گئے ہم سوچتے تھے کہ سجاد صاحب نے یہ کیا حماقت کی، جو ایسا شاندار بنگلہ بنا کر بیگم کے نام ہبہ کر دیا پھر ایسے خرچ نامہ بھی لکھ دیا شاید یہ پیش بندی بیگم صاحب نے خود کی ہو گی۔ کہ ان مہذبوں کا کیا اعتبار کل کلاں کو پردیس کیلئے جا کر قطع تعلق کر لیں تو زندگی کے دن کیسے کٹیں گے اسلئے اس نے شادی سے پہلے ہی تحریری طور پر اپنے مستقبل کو محفوظ کر لیا۔ اب کمائیں گے بیرسٹر صاحب اور عیش کریں گی بیگم صاحبہ مگر لیلیٰ کا کیا بنے گا کیا یہ ڈرامہ اب طلاق پر منتج ہو گا اسکا جواب ہمارے پاس نہ تھا۔

خیر میں گومگو کے عالم میں اگلی شام لیلیٰ کو پڑھانے گیا۔ بیگم صاحبہ اداس سی تھیں۔ وہ سلائیاں اور اون لیکر ہمارے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئیں میری ان سے پڑھائی کے علاوہ کبھی کوئی بات چیت نہیں ہوتی تھی اسلئے میں میاں بیوی کے قطع تعلق پر گفتگو کرنے کا مجاز نہ تھا۔ خیر میں پڑھا کر واپس آ گیا۔ بیگم خاموش تھیں اور لیلیٰ اداس۔ میرا دل بھی اس افسردہ ماحول میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دن اسی طرح گذرتے رہے۔ بیگم صاحب کی خاموشی گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اور میاں سے جدائیگی کا غم انھیں اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر چپ ہو جاتیں وہ روزانہ حسب معمول ہمارے قریب آ بیٹھتیں سلائیاں اور ان کے تانے بانے بنتی رہتیں مگر ان کا دھیان کسی اور ہی طرف ہوتا نہ ہی انھوں نے کبھی کوئی بات کی اور نہ میں ہی اس کی جرأت کر سکا میں اتوار کے بجائے جمعہ کو پڑھانے نہیں جاتا تھا ایک دن انھوں نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے عرض کیا۔ کہ اس دن میں دفتر سے نماز جمعہ پڑھنے کی آدھی چھٹی ہوتی ہے اسلئے میں پڑھانے نہیں آتا تھا وہ یکایک بولیں "بابو تم نے قرآن شریف پڑھا ہے؟"

"جی میں نے اپنے اسکول کے زمانے ہی میں پڑھا تھا" عربی زبان سمجھ لیتے ہیں آپ؟" انھوں نے پوچھا
جی ایک حد تک ــــ ویسے میرے پاس مترجم قرآن شریف ہے

کیا انگریزی میں بھی کوئی قرآن پاک ہے" انھوں نے اشتیاق بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "اب تو قرآن پاک دنیا کی تقریباً ہر مروجہ زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے"

"ہو سکے تو مجھے انگریزی میں کسی بلند پایہ مترجم قرآن پاک لا دیجئے میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں" یہ کہہ کر انھوں نے مجھے سو روپے کا نوٹ دے دیا۔

دوسرے دن میں علامہ عبداللہ یوسف علی کا Holy Quran لے کر گیا۔ بیگم صاحبہ نے بڑے احترام کے ساتھ اسے میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

اب موقع بموقع مجھ سے قرآن شریف کے متن اور ترجمہ پر تبادلہ خیال کرنے لگیں۔ قرآن خوانی اور اس کے معانی پر بحث کرنے میں میری حیثیت مبتدی کی سی تھی۔ پھر بھی میں اردو ترجمہ شدہ قرآن پاک کو باقاعدگی سے مطالعہ کرتے جاتا اور کافی دیر تک انھیں مطالب اور معانی سمجھانے کی کوشش کرتا رہتا۔

ان کا شوق مطالعہ دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ اب نیلی کی پڑھائی کے ساتھ ساتھ مجھے بیگم صاحبہ کو بھی پڑھانا پڑتا اور اس میں مجھے ایک قسم کی راحت سی محسوس ہوتی تھی، ایک قسم کا قلبی سکون۔

ایک دن میں نے انھیں طہارت۔ وضو اور نماز پڑھنے کا طریقہ بتایا اور اس کے فوراً بعد میں اس تبدیلی پر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ باقاعدگی سے پنجوقتہ نماز پڑھنے لگیں رمضان شریف میں انھوں نے بڑی پابندی سے روزے رکھے۔

کچھ دنوں بعد ہمارے دفتر کی مقررہ میعاد ختم ہو گئی اور میں بادل ناخواستہ ملازمت کی تلاش میں بیگم صاحبہ سے رخصت ہو کر پٹنہ چلا آیا۔ اور جلد ہی مجھے ریلوے میں گارڈ کی ملازمت مل گئی۔ ایک دن شاید ۱۹۵۳ء کا آغاز تھا۔ میں گاڑی چلانے کے لئے بریک سے باہر نکلا تو ایک صاحب نے آگے بڑھ کر کہا "گارڈ صاحب ایک منٹ رکیں۔ میرا سامان آرہا ہے" میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے سامنے سجاد صاحب تھے۔ انھوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور بڑی محبت کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملا کر خیریت دریافت کرنے لگے اتنے میں قلی دبے میں سامان لا دے آگئے۔ ان کے پیچھے پیچھے فیروزی ساڑی میں ملبوس ایک بیگم آرہی تھیں۔ قمیص شلوار پہنے ایک آٹھ نو سال کی لڑکی اٹیچی اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے تھی۔ یکایک سجاد صاحب بولے "نیلی بیٹی اپنے ماسٹر صاحب سے ملو"

وہ لڑکی حیرت بھری نگاہوں سے مجھے کچھ دیر تک گھڑی دیکھتی رہی۔ گارڈ کی یونیفارم نے اسے شک وشبہ میں ڈال رکھا تھا پھر وہ بے اختیار میری طرف بڑھی اور جھک کر سلام کیا میں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ فرط مسرت سے اس کا چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا تھا پھر ساڑی میں ملبوس بیگم صاحبہ نے السلام علیکم کہہ کر مجھے اپنی طرف مخاطب کر لیا میں حیران رہ گیا یہ وہی بیگم صاحبہ تھیں تروتازہ پھول کی طرح شگفتہ چہرہ پھر مسکرا کر بولیں "آپ گارڈ بن گئے ہیں یہ مجھے معلوم ہی نہ تھا"

بقیہ صفحہ ۔۔ پر

سیّد راشد علی حامدی

پاگل!!

رام لیلا گراؤنڈ سے واپسی پر ظہیر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "یار میں نے اتنی مدلل اور دلنشین تقریر آج تک نہیں سنی۔ مجھے تو اب یقین ہو چلا ہے کہ خدا اور مذہب صرف رجعت پسندوں کی ذہنی اپج اور خام خیالی ہے۔ یہ ساری چیزیں وہم اور خوف کی پیداوار ہیں۔ جو انسان کی اپنی فطرت سے ہم آہنگی کی بنا پر وجود میں آگئیں اور پھر کچھ چالاک لوگوں نے انسان کی اس کمزوری سے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔ لیکن کیونکہ اب سائنسی تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ کائنات ایک اتفاقی حادثہ کا نتیجہ ہے"۔ میں اس کی بات کا کیا جواب دیتا۔ میرے ذہن میں خود اسی قسم کے خیالات پرورش پا رہے تھے۔ باتیں کرتے ہوئے جب ہم ٹہلتے ٹہلتے دریا گنج میں داخل ہوئے تو فٹ پاتھ پر ایک جگہ بھیڑ دیکھ کر ہمارے قدم خود بخود اس طرف اٹھ گئے۔ بھیڑ کے وسط میں ایک سر بریدہ اور پریشان حال بوڑھا بیٹھا تھا جس کے چہرے سے غم روزگار کے آثار ہویدا تھے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا "میرا کوئی خدا نہیں۔ مجھے کہیں انصاف نہیں ملا۔ اگر اس دنیا کا کوئی خدا ہوتا تو یہ اندھیر نہ ہوتا۔ یہاں ہر ایک خدا ہے" میں بہت غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا کہ ظہیر نے مجھے جھنجھوڑ کر کہا "یار کیا بکواس سن رہے ہو پاگل ہے پاگل"۔ میرا ذہن جھنجھنا اٹھا۔ میں سوچنے لگا ان دونوں میں سے واقعی پاگل کون ہے وہ جس کی ہم ایک گھنٹہ تک تقریر سن کر آئے ہیں یا یہ بوڑھا؟؟

تہِ محرابِ مسجد سو گیا کون؟

مجلسِ شوریٰ انجمنِ طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح میں جن تجاویز اور سفارشوں کی باتیں

اقبال کے نزدیک زندہ قوموں کا نشان یہ ہے کہ صبح و شام ان کی تقدیریں بدلتی رہتی ہیں اور الٹنا پلٹنا جمعیت کر لینا اگر ہم غور کریں تو ایک بہانہ ہوتا ہے۔ ۲۰، ۲۱ ستمبر ۱۹۹۸ء کو جامعۃ الفلاح میں انجمن طلبہ قدیم کی شوریٰ میں اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ پچھلے امور کا جائزہ لیا جاتا رہا اور تنقید و احتساب کے مراحل سے گزر کر آئندہ کیلئے جذبوں اور امنگوں سے بھرپور پروگرام بنتے رہے۔ خدا کرے یہ منصوبے پایۂ تکمیل کو پہونچیں۔ طے پایا کہ:

دو سالہ اجلاس

۲۱، ۲۲ نومبر ۱۹۹۸ء کو انجمن کا دو سالہ اجلاس منعقد ہوگا جس کے کنوینر برادر نور محمد فلاحی ہوں گے اور معاونین مولانا عمران احمد فلاحی اور اشتیاق دانش فلاحی ہوں گے۔ اس اجلاس کا مفصل پروگرام اس شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

جامعۃ الفلاح کے طلبہ کی ہمت افزائی کیلئے سالانہ امتحان میں فرسٹ، سکنڈ اور تھرڈ پوزیشن حاصل کرنے والے طلبہ کو اس موقع پر انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔

طلبہ کی تحریری صلاحیتیں پروان چڑھانے کیلئے الاستاذ مولانا جلیل احسن ایوارڈ کی تقسیم کا اہتمام کیا جائے گا اس کیلئے ایک تحریری مقابلہ کرایا جائے گا۔ اس مقابلہ کا انتظام دو افراد کی کمیٹی کرے گی جس میں شیخ نعیم الحق عمری مدنی اور مولانا انور محمد فلاحی شامل ہیں۔

اس اجلاس کیلئے فنڈ فراہم کرنے کی ذمہ داری برادر عبد السلام مبشر کی ہوگی۔

اس اجلاس میں تمام فلاحی شریک ہوں گے اور ہر ممکن جد و جہد کرکے اسے کامیاب بنائیں گے۔

اس سال کلیۃ البنات سے ... کا پہلا گروپ فارغ ہو رہا ہے کوشش ... کہ انجمن طالبات قدیم قائم کیا جائے اور ان بہنوں کے اندر دینی تحریکی امور سے دلچسپی پیدا کی جائے اور جامعہ کی ترقی و تعمیر میں انھیں شریک کیا جائے۔

حیاتِ نو: کے سلسلے میں درج ذیل امور طے پائے۔

ہر قیمت حیات نو کا اجراء جاری رہے گا اور اس کیلئے ہر ممکن سعی و جہد کی جائے گی۔

ایک ہمہ وقتی ایڈیٹر ضرور رکھا جائے گا تاکہ رسالہ پابندی سے نکل سکے اور اپنے مقصد کو حاصل کر سکے۔ اس کے صفحات ۳۲ سے بڑھا کر ۴۸ کر دیئے گئے۔ عارضی طور پر برادر راشد حامدی کو معاون مدیر بنایا گیا ہے جو اس کی اشاعت کیلئے ہر ممکن جد و جہد کر رہے ہیں مجلس ادارت میں ڈاکٹر اطہر ریحان فلاحی (مقیم حال سعودی عرب) کا نام بڑھا دیا گیا ہے اب آئندہ سے ہر شمارہ میں مجلس ادارت کا نام دیا کرے گا۔

حیات نو کا صحافتی معیار بڑھایا جائیگا اور تمام اہل قلم کا تعاون حاصل کیا جائیگا۔ جامعۃ الفلاح کی تعلیمی روش اور دیگر تمام امور پر کھل کر گفتگو ہوئی اور اس سلسلے میں کچھ اقدامات طے پائے۔ خدا کرے یہ فیصلے پائیدار ہوں اور مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہوں۔ آمین

شفیق طاہری

غزل

جو فردِ جرم ہے تاریخ کے حوالے میں
ورق ورق پہ مرا نام ہے حوالے میں

نیا مداوہ، نئے چارہ گر، نئی تشخیص
یہ اہتمام مرے درد کے ازالے میں

درونِ شہر نہ تھی اتنی روشنی پہلے
کوئی مکان نہ جلتا ہو اس اجالے میں

بس اس خطا پہ ہوا صدرِ انجمن ناراض
ضمیر بول رہا ہے مرے مقالے میں

فقیہ شہر اسے بھی حرام کہتا ہے
جو مے ذرا سی بچی ہے مرے پیالے میں

مرے سواد کے منصب سفر دیتا
نہ تھا شعورِ مسافت کسی جیالے میں

سبھی تھے خوف سے قاتل کے مصلحت گفتار
بس ایک میرا ہی کردار تھا اجالے میں

غضب غضب کہ وہ بالیں تک آ کے لوٹ گیا
مریضِ ہجر تو تھا آخری سنبھالے میں

گرفتِ تیغ میں ہیں جنگی میتوں کے ہجوم
یہ شہ سوار کبھی تھے ترے رسالے میں

شفیق وہ وقت کسی قوم پر نہ آئے کبھی
رہیں زبان و قلم، شاعروں کے تالے میں

محمد سمیع اختر

عالمِ اسلام

جماعت شعر کا نقش قدم [illegible]

مصری حکومت نے ہزاروں اسلام پسند نوجوانوں کو اس غلطی کی پاداش میں نظر بند کر دیا ہے کہ وہ اسلامی شعائر اور رسومات کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں۔ قاہرہ سے آنے والوں نے بتایا ہے کہ مصری خواتین پولیس نے ماہ رمضان میں مساجد میں آنے والوں کا ناطقہ بند کر رکھا ہے کیونکہ مسلم نوجوانوں نے حکومت کا طوق اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے۔ اور مسلم طلبہ کی ایک بڑی تعداد نے داڑھیاں رکھ لی ہیں اور اسی طرح طالبات بھی پردہ کرنے لگی ہیں۔

چونکہ مصری عوام ماہ رمضان میں اعتکاف کرنے کے عادی ہیں لیکن اس سال اعتکاف ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اور پولیس افسروں کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ مسجد کے اماموں سے معتکفین کی لسٹ طلب کریں۔ مزید برآں حکومت کی طرف سے بہت سے کارندے جو اجتماعات اور ذکر و اذکار کی محفلوں میں جاسوسی کے لیے بھیجے جانے لگے ہیں۔ جن اماموں اور نوجوانوں نے مطلوبہ چارٹ پیش کرنے سے انکار کر دیا اس لئے کہ وہ تمام ہی نام فوراً ہی بلیک لسٹ میں درج کر لئے جاتے ہیں۔ اور پھر پوچھ گچھ اور تفتیش کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے جس سے گھبرا کر لوگوں نے مساجد میں نماز با جماعت کے بجائے انفرادی نمازوں پر اکتفا کر لیا ہے۔ اور یہ تمام کارروائیاں کہاں ہو رہی ہیں؟ ایک اسلامی ملک مصر میں جہاں الازہر ہے۔ اللہ تعالیٰ مصر کو ان سے نجات دے۔

ایک خوشگوار تبدیلی اور مسرت افزا خبر یہ بھی ملی ہے کہ مصری حکومت نے اسلامی تعلیمات کا لحاظ کرتے ہوئے شراب بندی کا قانون نافذ کر دیا ہے اور دیگر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ مبارک نے مصری اسلامی تحریک سے خوفزدہ ہو کر یہ احکامات جاری کئے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے ان متضاد چیزوں کی روشنی میں مصر کی سیاسی حالت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شیر اپنے کچھار سے نکل چکا ہے خدا خیر کرے!!

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

صومالیہ اور ایتھوپیا کے مابین ایک عرصے سے جنگ جاری ہے۔ صومالیہ اقوام عالم میں اسلامی ملک کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ وہاں کی اکثر آبادی مسلم ہے جہاں صومالی کے بچوں کی ایک معتدبہ تعداد کو قیدی بنا کر جیل کی آہنی دیواروں کے پیچھے ڈھکیل دیا گیا اور اب تک ان کا فیصلہ نہیں ہو سکا ہے۔ بنادریا سلطنت کی عدالت میں مسٹر اور مسز روزی جارڈن جو [illegible] نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے وکیل محمد راقی محمد کی جانب سے ان قیدی بچوں کو متبنیٰ بنانے کا مطالبہ پیش کیا گیا اور عدالت نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔ جس کے مطابق تیس ہزار نو سو تین صومالی مسلم بچوں کو متبنیٰ بنانے کا حق ان کو حاصل ہو گیا ہے۔

اس خبر کے نشر ہوتے ہی پورے صومالیہ میں خوف و دہشت کی لہر دوڑ گئی۔ عوام نے یکساں طور پر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ صومالیہ ایک ایسا اسلامی ملک ہے جہاں کی اکثریت نے ایک

وجہ پہلے ہی انگریزی کی اور فرانسیسی تقلید کا علاوہ اپنے کا دن کو آثار چھپا ہے جہاں گزشتہ دس سالوں سے کسی ایک شخص نے بھی نصرانیت کو قبول نہیں کیا۔ لیکن اس ملک کی ایک عدالت نے صدر کے تحریری بیان کے دباؤ میں آکر کے ایک ہی شخص کو تیس ۳۰ ہزار سے زیادہ صومالی مسلم بچوں کو یتیم بنانے اور اپنی مرضی کے مطابق ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا حق دے دیا ہے۔ یہ تو ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جو کہ لوگوں کی نظروں میں آگیا ورنہ اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جن کی بابت دنیا جان بھی نہیں پاتی۔ افریقہ کی لاکھوں آبادی جس میں مسلمانوں کا تناسب ۸۰ فیصد سے بھی زائد تھا۔ اب یہ تناسب عیسائی مشنریوں اور پادریوں کی کوششوں سے گھٹ کر ۳۰ فیصد سے بھی کم رہ گیا ہے۔

آج جو مسئلہ لوگوں کے لئے سوالیہ نشان بنا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ عالم اسلام ایسے واقعات و حادثات پر کون سا موقف اختیار کرے ۔۔۔ قارئین یہ گمان نہ کریں کہ اس طرح کے حالات صرف افریقی ممالک، ایتھوپیا، انڈونیشیا، فلپائن، الجیریا اور ہندوستان ہی تک محدود ہیں بلکہ پاکستان جیسے ملک میں بھی ہزاروں عیسائی مشنریاں اور لاکھوں پادری عیسائیت کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں کے باشندے بھوک و فاقہ کشی متعدد امراض، جہالت و ناخواندگی اور پسماندگی کا شکار ہیں۔ یہی وہ اسباب ہیں جنھوں نے وہاں کے باشندوں کو عیسائیت کی گود میں ڈال دیا ہے۔

ان عیسائی مبلغین کی تعداد ایک لاکھ سے زائد ہے جو صرف افریقی ممالک میں عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے خاص ہیں۔ اور ان کے معاونین کی تعداد ساٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اور ان تعلیمی اداروں کی تعداد بیس ہزار سے زائد ہے جو افریقہ میں کنیسہ کے تحت چل رہے ہیں علاوہ ازیں ان پادریوں کے تحت پوری دنیا میں دیگر پانچ سو زائد کالجز اور یونیورسٹیز چل رہی ہیں۔ اور ان طلبہ کی تعداد تقریباً پچاس ہزار ہے جن کی تعلیم تربیت پر عیسائی مبلغین اور عیسائی مشنریاں بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اور ان روحانی خانقاہوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہے جن میں عیسائی مبلغین اور دیگر پادریوں کو تربیت دی جاتی ہے اور ایسے کنڈرگارٹنوں کی تعداد تقریباً ۲ ہزار سے اوپر ہو چکی ہے جو ان پادریوں کی ادارت میں چل رہے ہیں اور ایسے اسپتالوں کی تعداد پانچ سو سے زیادہ ہے جن کا قیام عیسائی مشنریوں کے تحت عمل میں آیا ہے اور ایسے دواخانوں کی تعداد بھی ایک ہزار سے کم نہیں جہاں سے دواؤں کے ساتھ انجیل کے نسخے اور صلیب تقسیم کی جاتی ہیں۔

آخر مسلمان اس جمود و تعطل کی دلدل سے کب نکلیں گے اور عیسائیت کے اس سیلاب پر کب بند لگایا جا سکے گا آخر ان کی رگ حمیت کیوں انہیں پھڑکتی ان کا خون جوش میں کیوں نہیں آتا جبکہ وہ آج دنیا کی قوموں میں افرادی لحاظ سے اور مالی لحاظ سے سب سے زیادہ مضبوط قوم ہیں

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

(الدعوۃ مصری سے تلخیص و ترجمانی)

**

اگر کسی وجہ سے حیات نو آپ کو نہ مل سکے تو فوراً ہمیں خط لکھیں ہم انشاء اللہ تلافی کی کوشش کریں گے۔

(ادارہ)

کھرے کھوٹے

جرأت بے مدعا

مصنف :- مظہر علی شاہ شاد وارثی

طباعت :- عمدہ

قیمت :- پندرہ روپئے

ملنے کا پتہ :- درگاہ شریف حضرت ابوالحسن شاہ وارثی محلہ کڑہ شہاب خاں اٹاوہ یو۔پی

"جرأت بے مدعا" حضرت مظہر علی شاہ وارثی کا مجموعہ کلام ہے
جن کا شمار ہمارے صوبہ کے بزرگ اور مقدم شعراء میں ہے۔ حضرت شاد
نہ صرف تصوف سے آشنا ہیں بلکہ درگاہ شریف ابوالحسن شاہ وارثی کے
خادموں میں سے ہیں اس لئے ان کے کلام میں نہایت درجہ لطافت
بلندی، پاکیزگی اور حسن خیال کے جلوے ملتے ہیں ان کے یہاں
دوم درجہ کی چیزیں نہیں ملیں گی۔ اس طرح کے اشعار تو بکثرت ہیں کہ
جنھیں ایک بار پڑھ کر بھلایا نہیں جاسکتا۔ احترام حسن اور عشق
کی کیفیت، تصوف کی چاشنی اور حسن اخلاق کی خوشبو سے ہر
مصرعہ مہکتا ہے۔ زیادہ اقتباس اور مثالوں کی تو یہاں گنجائش
نہیں ہے لیکن چند معروف شعر پیش ہیں اردو شاعری کے لئے
[illegible] ہیں
وقارِ ضبط کی [illegible]

دعویٰ عشق و محبت پر تو اُف بھی گناہ
درسِ ضبطِ شوق ہے خاموش بربادی کا

پہنچنے ہی کو ہوں جیسے ہیں اپنی حد منزل
تسلی یوں مجھے منزل بہ منزل ہوتی جاتی

دل کی کشتی غم کی موجوں کے تھپیڑے کھائے گی
الوداع اے ناخدائے عشق کی گھبرائے گی

آنسوؤں کا رولنا لیا اب کوئی آساں نہیں
دل کو مرعوب نگاہِ ناز چھیڑے جاتی ہے

طولِ شبِ فراق کی حد تو ضرور ہے
وہ کیا کرے کہ جس کو امید سحر نہیں

ادب و شعر کا ذوق رکھنے والے حضرات اور خصوصاً ارباب

تصوف کیلئے یہ مختصر سا مجموعہ کلام خاصے کی چیز ہے۔

(مولانا عبدالحلیم صاحب ایم اے، بی ایڈ)

نام کتاب: اسلامی کردار

مصنف: استاذ محمد غزالی

مترجم: عبیداللہ فہد فلاحی

قیمت: ۲۰ روپئے

صفحات: ۳۳۶

ناشر: ہندوستان پبلشرز ۳۵۰۔۳۲۰۳ گلی قاسم جان دہلی ۶

اسلامی کردار کے موضوع پر یہ جامع تصنیف مشہور اخوانی رہنما محمد غزالی کی ہے، جو اب اردو حلقے میں غیر معروف نہیں رہے اس سے پہلے مصنف موصوف کی کتاب "عقیدۂ اسلامی" کریسنٹ پبلشنگ کمپنی سال گذشتہ شائع کر چکی ہے۔ زیر نظر کتاب اخلاق کے ہم جہتی تصور پر مشتمل ہے مصنف نے اخلاق کی بہت سی اقسام مثلاً رعب و دبدبہ، کفایت شعاری و میانہ روی، دوستوں کا انتخاب، علم و عقل، وقت سے بھرپور استفادہ اور زمانہ سے عبرت پذیری کو بھی شامل کیا ہے۔ مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ ہمارے اندر یہ سارا اخلاقی نقصان کی وجہ ہے اور اخلاق ایمان سے پیدا ہوتا ہے، جس دل میں ایمان نہ ہو وہاں اخلاق کا پودا پھل پھول نہیں سکتا بقول اقبال ؎

مسلماں کے دل پریشاں یہ جذب و ذوق کہ جذب اندرون باقی نہیں ہے

کتاب کی افادیت اپنی جگہ مسلم ہے اور مترجم نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے اسے اردو قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے لیکن پھر بھی چند چیزیں کھٹکتی ہیں۔

۱۔ حروف بہت باریک ہیں اور صفحات کی قدوقامت کے لحاظ سے متجاوز زیادہ ہے جس کی وجہ سے قارئین کو پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

۲۔ ترجمہ اپنی محنت اور سلاست کے باوجود مزید چاشنی اور توجہ چاہتا ہے عبارتوں میں کہیں کہیں جھول ہے، مجھے امید ہے کہ تھوڑی سی توجہ سے دور ہو جائے گا۔

۳۔ اردو داں حلقہ کے لئے ۳۳۶ صفحے کی کتاب کو ۲۰ روپئے میں خریدنا بہت مشکل ہے اس لئے طالبعلموں کے قیمتی میں قارئین کی جیبوں پر بھی نگاہ رہے۔

۴۔ ورق رسم الخط شکستہ ہے کتابت کی کہیں کہیں غلطیاں بھی ہیں، اس لئے اس جانب توجہ کی ضرورت ہے۔

ویسے کتاب اپنی افادیت کے لحاظ سے چنداں محتاج نہیں اور اردو داں حلقوں کی طرف سے مترجم مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ضیاء الرحمن

نرم گرم

حلقۂ یاران

اس شمارہ کے مضامین آپ کو کیسے لگے؟ اپنی رائے سے مطلع فرمائیں، اور حلقۂ یاراں میں شامل ہوں۔ اس کالم کے تحت عالم اسلام اور وطن عزیز میں ہونے والے واقعات پر مختصر تبصرہ بھی شامل اشاعت کیا جا سکتا ہے۔

جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم

ڈاک کا شکر گذار میں ہوں یا آپ؟ میرے پتہ میں آپ نے ایسے شعبہ کا نام لکھا ہے جس کا وجود اس یونیورسٹی میں نہیں ہے۔ میں psychology نہیں sociology کے شعبہ میں ہوں۔

حیات نو کا یہ پہلا شمارہ ہے جس کے مطالعہ کا شرف مجھے نصیب ہوا۔ قدر افزائی کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

مسعود ثانی اس میں کوئی شک نہیں کہ (Legendary) شخصیت تھے لیکن ان کی جتنی شرحیاں آپ نے شائع کی ہیں، ان میں چوری، جھوٹ، عیاری، فریب وغیرہ کو بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ انہیں کسی بھی صالح طالب علم کے لئے کردار کا شگفتہ نمونہ نہیں بنایا جا سکتا۔ آپ سوچیں کہ ان شخصیتوں سے آپ نوخیز بچے ذہنوں کو کس نوعیت کی تشویق دلا رہے ہیں!

میری نیک خواہشات آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں کے حوصلے بلند رکھے۔ آمین!

والسلام
ابن فرید
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ڈیئر ایڈیٹر صاحب،

سلام مسنون

حیات نو کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ جان میں جان آئی۔ حیات نو دیکھ کر دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ابھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جو کسی ذاتی مفاد کے بغیر محض خدا کی خوشنودی کے لیے دعوت حق کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور اپنے محدود وسائل کے باوجود اپنے حلقہ کار اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

خدا کرے حیات نو ملت اسلامیہ کے لیے زندگی اور حرارت بخش ثابت ہو۔

میری نیک تمنائیں اور دلی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

فقط
والسلام
آپ کا مخلص
عبداللہ [illegible]

جامعہ کے لیل و نہار

جمعیۃ الطلبہ کے نئے ذمہ داران کا انتخاب:

حسب دستور سال نو کے آغاز پر طلبہ اور اساتذہ کے ایک مشترکہ اجلاس میں جمعیۃ الطلبہ کے زیر اہتمام چلنے والے مختلف شعبوں کے ذمہ داران کا انتخاب عمل میں آیا۔ انتخاب سے قبل محترم صدر مدرس جناب مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی نے طلبہ کے سامنے انتخاب کے اسلامی اصولوں پر روشنی ڈالی اور طلبہ کو نصیحت کی کہ وہ تمام تعصبات سے پاک ہو طلبہ کی صلاحیت و دیانت کو مد نظر رکھتے ہوئے پوری امانت و دیانت کیساتھ اپنی جمعیۃ کے ذمہ داران کا انتخاب کریں بعد ازاں طلبہ نے جمعیۃ الطلبہ کے مختلف شعبہ جات کے لئے مندرجہ ذیل طلبہ کو منتخب کیا۔

①	صبیح احمد ایوبی	سکریٹری جمعیۃ الطلبہ
②	زبیر احمد جمالی	معتمد لائبریری
③	محمد اعظم	معتمد اردو گروپ ۱
④	عبد العزیز بلرامپوری	" " گروپ ۲
⑤	شکیل احمد جمالی	معتمد عربی
⑥	طاہر حسین نیپالی	" انگلش
⑦	محمد محفوظ خاں	" مطبخ
⑧	عبد العزیز بمبئی	" اسٹور
⑨	اطہر احسن مستقیمی	معتمد اخبارات و رسائل
⑩	عبد الحفیظ بستوی	معتمد کیمپ۔

انتخاب کے بعد جناب مولانا اقبال احمد قاسمی صاحب نے بحیثیت سرپرست جمعیۃ الطلبہ منتخب شدہ ذمہ داران کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

جن طلبہ کو ذمہ داریاں تفویض کی گئی ہیں وہ اپنے کو دیگر ساتھیوں سے برتر نہ سمجھیں، کامل احساس ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض کی بجا آوری میں لگ جائیں۔ اپنے کو طلبہ کا خادم سمجھ کر کام کریں نہ کہ مخدوم، حدیث نبوی ہے سید القوم خادمہا قوم کا سردار قوم کا خادم ہوتا ہے پھر آپ نے تمام طلبہ کو ہدایت کی کہ وہ اپنی جمعیۃ کے ذمہ داران، جن کو آپ نے اپنی مرضی اور خوشی سے منتخب کیا ہے، کا تعاون کریں بصورت دیگر وہ اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام نہ دے سکیں گے۔

تقریب یوم آزادی:

۱۵ اگست ۱۹۸۲ء کو جامعۃ الفلاح میں یوم آزادی کی مناسبت سے ایک جلسہ کا اہتمام کیا گیا جس میں تقریباً تمام ہی طلبہ نے شرکت کی۔ صدارت کے فرائض مولانا ابوبکر اصلاحی صاحب نے انجام دیئے۔

تلاوت کلام پاک کے بعد جلسہ کا آغاز اقبال کے ملی ترانہ سے کیا گیا۔ بعد ازاں تقریری سلسلہ شروع ہوا جس میں مندرجہ ذیل طلبہ نے حصہ لیا۔ عبد اللہ الحنیف درجہ عربی ہفتم، محمد اعظم درجہ عربی ششم، ذبیح اقدس درجہ عربی ششم، توقیر عالم درجہ عربی پنجم، عبد الحی فاروقی درجہ عربی پنجم، محمد امین کشمیری درجہ عربی سوم۔

عبد اللہ الحنیف نے بہت ٹھہرے ہوئے اور سنجیدہ

انداز میں لوگوں کو آزادی کے اصل مفہوم سے آگاہ کیا۔ کہ ہم نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں انگریزوں کی غلامی سے نجات تو حاصل کر لی لیکن ہم ابھی بہت سی غلامیوں میں جکڑے ہوئے ہیں ہمارے سامنے آنحضورؐ کا اسوہ ہونا چاہئے جنھوں نے دنیا کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دلائی تھی آج ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں کون سی آزادی مطلوب ہے۔ وہ آزادی جس نے لوگوں کو تمام بندگان خدا کی غلامی سے نکال کر خدائے حقیقی کے آگے جھکایا تھا۔ جس نے لوگوں کے ظاہری حالات واعمال ہی نہیں بلکہ ان کے رجحانات، احساسات اور خیالات بھی بدل کر رکھ دیئے یا ہم وہ آزادی چاہتے ہیں جو ہمارے سروں پر لادینی secular اسٹیٹ مسلط کر دے جس کے نتیجہ میں انسان حیوان سے بھی بدتر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ دن ہمیں متنبہ کرتا ہے کہ ہمارا مقصود وہ آزادی ہے جو آج سے چار سال پہلے حاصل کی گئی تھی۔

اس کے بعد فضیل اقدس اور محمد امین کشمیری نے پرجوش انداز میں آزادی کے ثمرات بیان کئے۔ دونوں ہی نے اس بات پر زور دیا کہ بلاشبہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہم نے انگریزوں کے تسلط سے اپنے ملک کو آزاد کرایا لیکن ہم آج بھی بدستور غلام ہیں۔ اس آزادی کے بعد بھی ہمارا بال بال غلامی کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے۔ ہم نے ہندوستان کی سیاسی آزادی تو حاصل کر لی لیکن ہم ذہنی وفکری اعتبار سے اب بھی ان نظریات کے غلام ہیں جو انگریز سامراج ہمارے ملک میں لیکر آیا تھا ہم اپنے ہاتھوں اپنے تہذیبی ورثہ کو پامال کر رہے ہیں ہمارے تہذیب وتمدن افکار وخیالات اور رسم ورواج پر آج بھی مغربی تہذیب کی گہری چھاپ موجود ہے۔ دوران تقریر انھوں نے ہندوستانی سیاسی لیڈروں پر آزادانہ تبصرہ کیا اور ان کی اخلاقی حالت کا تجزیہ کرکے بتایا کہ اسلام کا نظام حیات ہی ان سب مسائل کو حل کر سکتا ہے۔

اس کے بعد محمد اعظم درجہ عربی ششم نے آزادی کے مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آزادی اس کا نام نہیں کہ انسان شتر بے مہار ہو جائے اور تمام اخلاقی، دینی اور روحانی اقدار کو غلامی تصور کرے بلکہ ہماری زندگی اسی میں ہے کہ ہم کچھ حدود وقیود کے پابند ہوں ؎

صنوبر باغ میں آزاد بھی ہے پابہ گل بھی ہے
انہی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

توقیر عالم درجہ عربی پنجم نے "ہندوستان کی آزادی میں مسلمانوں کا کردار" کے موضوع پر تقریر کی اور ان کی کوششوں قربانیوں اور آزمائشوں سے بھری ہوئی داستان بیان کی۔ آخر میں عبد الحیٔ فاروق نے مقالہ کی شکل میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اس کے بعد صدر جلسہ مولانا ابو بکر اصلاحی صاحب نے اپنے اختتامی کلمات میں فرمایا:

انگریزوں کے دور میں ہمارے دانشوروں اور مفکرین نے یہ سمجھا کہ ہماری تمام پریشانیوں کا سبب انگریزوں کا تسلط ہے۔ انھوں نے مرض کی تشخیص کرنی چاہی مگر وہ صحیح طور پر مرض کی تشخیص نہ کر سکے انھوں نے یہ سمجھا کہ آزادی کے بعد تمام پریشانیوں کا خاتمہ ہو جائے گا مگر ان کی یہ تشخیص غلط ثابت ہوئی حالانکہ اس دور کے عظیم مفکر مولانا مودودیؒ نے اپنی تشخیص پیش کی جو سو فیصدی صحیح تھی وہ یہ کہ ہماری پریشانیوں کا اصل سبب انگریز نہیں بلکہ انسانوں پر انسانوں کی حکمرانی ہے۔

آج ہر شخص کو اس بات کا اندازہ ہے کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد بھی ہماری پریشانیاں کم نہیں ہوئیں بلکہ کچھ اور بڑھ گئیں ہیں۔

اس وقت ہمارا فرض ہے کہ اصل مرض کی تشخیص کریں

(بقیہ صفحہ ۴)